ایچ ای سی (HEC) معیار کے مطابق

ششماہی

التبیین

Print ISSN: 2664-1178
Online ISSN: 2664-1186

جولائی۔ دسمبر 2018ء، جلد:2، شمارہ:2

DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES

THE UNIVERSITY OF LAHORE

شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

THE UNIVERSITY OF LAHORE

ششماہی

التَّبْیِین

جلد:2 شمارہ:2

جولائی۔دسمبر2018ء

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد امین

مدیران

ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری

ڈاکٹر شہزادہ عمران ایوب

شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

خط کتابت: مدیر اعلیٰ، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، 1 کلومیٹر ڈیفنس روڈ، لاہور

مطبع: دی یونیورسٹی آف لاہور پریس قیمت : 200روپے

ای میل: altabyeen@ais.uol.edu.pk ویب سائٹ: www.islamic.uol.edu.pk

مجلس نظامت

سرپرست:	جناب اویس رؤف	(چیئرمین بورڈ آف گورنرز، دی یونیورسٹی آف لاہور)
مدیر اعلیٰ:	ڈاکٹر محمد امین	(پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور)
مدیران:	ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری	(ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور)
	ڈاکٹر شہزادہ عمران ایوب	(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور)

مجلس مشاورت [بین الاقوامی]

پروفیسر ڈاکٹر صالح محمد العقیل	(سعودی عرب)	پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	(انڈیا)
پروفیسر ڈاکٹر غلام محمد قمر الازہری	(امریکہ)	ڈاکٹر سید محمد کفیل قاسمی	(انڈیا)
پروفیسر ڈاکٹر مشتاق گوہر	(امریکہ)	پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد	(ملائیشیا)
پروفیسر ڈاکٹر منیر الازہری	(برطانیہ)	ڈاکٹر سکری صالح	(ملائیشیا)
ڈاکٹر محمد رفیق حبیب	(برطانیہ)	ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد	(کویت)
پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم	(برطانیہ)	پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم	(مصر)
پروفیسر ڈاکٹر صہیب حسن	(برطانیہ)	پروفیسر ڈاکٹر درمش بلگر	(ترکی)

مجلس مشاورت [قومی]

پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن	(اسلام آباد)	پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس	(فیصل آباد)
پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی	(لاہور)	پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی	(کوئٹہ)
پروفیسر ڈاکٹر محمد اعجاز	(لاہور)	پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	(ملتان)
پروفیسر ڈاکٹر سلطان شاہ	(لاہور)	ڈاکٹر حافظ افتخار احمد	(بہاولپور)
پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء	(پشاور)	پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا	(لاہور)
پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی	(اسلام آباد)	ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں	(لاہور)

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

- ششماہی تحقیقی مجلہ "التبیین" میں مقالہ کی اشاعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ فاضل مقالہ نگار کی ذاتی اور غیر مطبوعہ تحقیق ہو۔
- مقالہ کی سافٹ کاپی ورڈ فارمیٹ میں کمپوز شدہ صورت میں ای میل کی جائے اور اس کے شروع میں انگریزی میں کم از کم 150 الفاظ میں اس کا Abstract موجود ہو۔
- کمپوزنگ مائیکروسافٹ ورڈ میں کی جائے۔ اردو متن کا سائز 15 اور فونٹ جمیل نوری نستعلیق ہو، عربی متن قرآنی کا سائز 14 اور فونٹ القلم قرآنک ویب لگایا جائے۔ باقی عربی متن کا سائز 14 اور فونٹ لوتس لینوٹائپ ہونا چاہیے۔ انگریزی کا سائز 12 اور فونٹ ٹائم نیو رومن لگایا جائے۔
- نصی اقتباس کی صورت میں مصنف کی اصل عبارت (عربی ہو یا انگلش) تحریر کریں اور پھر اس کا ترجمہ دیں۔
- مقالہ کے متن میں حوالہ جات کے نمبر ہر صفحہ پر الگ شروع ہوں۔ حوالہ جات ہر صفحہ کے آخر میں درج کیے جائیں اور حوالہ کے لیے درج ذیل طریق اختیار کیا جائے:

الف۔ اردو اور فارسی کتاب کا حوالہ:

علامہ، شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، دار العلم، اسلام آباد، طبع اول، 1989ء 3:20

ب۔ عربی کتاب کا حوالہ:

الشافعي، محمد بن إدريس، الرّسالة، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، 1388هـ ص:125

ج۔ اردو تحقیقی مجلّہ کا حوالہ:

حافظ احمد سلطان، "علم مختلف الحدیث"، القلم، لاہور، جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 2، جون 2013ء، ص:13-27

د۔ انگریزی کتاب کا حوالہ:

C. R. Kothari, *Research Methodology*, New Age Publishers, India, 2004, P: 140

ھ۔ انگریزی تحقیقی مجلہ کا حوالہ:

Islahi, Abdul Azim, *Economic Ideas of Ibn `Abidin*, Islamic Studies, Islamabad, Vol: 53, Issue: 2, Dec. 2014, P: 112-128

و۔ ویب سائٹ / آن لائن مقالے کا حوالہ:

محمد سلیم، "اسلام میں تحدید ملکیت کا تصور"، تاریخ استفادہ: ۲۰ دسمبر ۲۰۱۸ء
http://pu.edu.pk/home/journal/aladwa/Previous-Issue.html

تعارف شرکاء

ڈاکٹر محمد ادریس لودھی	ڈائریکٹر سیرت چیئر وچیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ بہاؤالدین زکریایونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر محمد ارشد	ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر نسیم محمود	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر حافظ محمد شبیر احمد	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور
حافظ صدام حسین حسنی	لیکچرر یونیورسٹی کالج آف ڈیرہ مراد جمالی نصیر آباد، بلوچستان
ابوالحسن احمد	پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور
خدیجہ اکبر خان	پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور
فرخ سوار خوشحالی	پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ منہاج یونیورسٹی، لاہور

فہرستِ مضامین

اداریہ	مدیر	06
اسلامی معاشرت (سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں)		
• بیمار و معذور افراد کے حقوق	ڈاکٹر محمد ادریس لودھی	07
• نکاح میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل	ڈاکٹر محمد ارشد سدرہ فردوس	28
• اولڈ ایج ہومز اور والدین کی کفالت کا تصور	ڈاکٹر نسیم محمود اقراء خالد	49
• کزن میرج کی شرعی و طبّی حیثیت	ڈاکٹر حافظ محمد شبیر احمد	78
اسلام اور عصر حاضر		
• انتہا پسندی کے اسباب اور علاج	حافظ صدام حسین حسنی	97
• صہیونی توسیعی عزائم اور مغربی طاقتوں کا کردار	ابو الحسن احمد ڈاکٹر محمد امین	119
تعلیم و تربیت		
• پاکستان کی نظریاتی اساس اور موجودہ نصاب تعلیم	خدیجہ اکبر خان ڈاکٹر حافظ انس نضر	134
فقہ و اصول فقہ		
امام ابو حنیفہ اور صاحبین میں اسباب اختلاف	فرخ سوار خوشحالی ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری	155

ادارہ کا مقالہ نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

پیش لفظ

التبیین کا تیسرا شمارہ حاضر خدمت ہے۔

ہماری درخواست پر اہل علم نے آج کے مسلم معاشرے کو درپیش مسائل کا سیرۃ النبی ﷺ کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور اہم معاشرتی مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

اسلام اور عصر حاضر کے حوالے سے مسلم معاشرے میں انتہا پسندی اور مسئلہ فلسطین میں مغربی طاقتوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فقہ و اصول فقہ اور تعلیم و تربیت بھی حسب سابق ہمارے مطالعہ کا موضوع رہے ہیں۔

ہمیں اپنے کام پر اہل علم کی آراء و تبصروں کا انتظار رہے گا۔

مدیر اعلیٰ

بیمار اور معذور افراد کے حقوق

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد ادریس لودھیؒ

ABSTRACT

This research paper primarily aims to analyze rights of handicapped, disabled and sick persons in light of Seerah of the Prophet (SAW). He always treated such people with great respect and care. Many steps were taken by him to eliminate sense of deprivation of such people in order to uplift their status as dignified citizen. The Holy Prophet (SAW) used to give preference and extra protocol while interacting with these special persons in comparison with physically normal human beings. He also used to visit sick persons to inquire about their health and to console them and also instructed his followers to do the same. He used to pray for them and taught them supplications to overcome their depression and stress.

Keywords: معذور افراد، وہیل چیئر، ناتواں، خصوصی افراد، خدمت، انسانیت، لسانی تعصبات

زیر نظر مضمون میں بیمار اور معذور افراد کے حقوق کو سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں عقلی دلائل، عصری ضرورت اور تاریخی استشہاد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ معذور افراد سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیدائشی یا حادثاتی طور پر جسمانی اور ذہنی عوارض میں عارضی یا دائمی طور پر مبتلا ہوں۔ لفظ حق در اصل باطل کی ضد ہے۔ کسی شے کی حقیقت کو عقلاً و عملاً ویسا ہی سمجھا جائے جیسی کہ وہ ہے تو اسے حق کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ 227 بار اسم مذکر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ سچائی، انصاف اور وجوبیت کے معنوں میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسلامی

---

* ڈائریکٹر سیرت چیئر و چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

تعلیمات کا مزاج یہ ہے کہ معاشرے میں جو فرد جتنا کمزور ہوتا ہے اس کی اتنی ہی حفاظت اور نگہداشت کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں نظری توحید کے بعد شرف انسانیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ معذور اور بیمار افراد کے حقوق دراصل انسانی شرف و منزلت کا مستقل حصہ ہیں۔ سیرت النبی میں ایسے افراد کے انسانی، سماجی، معاشی، طبی اور تعلیمی حقوق کے اعتقادی اور عملی نمونے ملتے ہیں جن سے ان افراد کی محتاجی کی وجہ سے ان میں احساس کمتری اور احساس محکومیت پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا تھے۔ ان کی قدر و منزلت کا واقعہ سورہ عبس میں ملتا ہے۔ حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے نابینا ہونے کے باوجود غزوۂ بدر میں شرکت کی۔ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ پاؤں سے معذور تھے، اس کے باوجود غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔

عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں یہ افراد کار گاہ حیات میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریاست ان کی کفیل تھی، معاشرہ ان کا محافظ تھا اور وہ خود بھی باہمت اور خوددار تھے۔ انہوں نے اپنی معذوری کو مجبوری کا درجہ نہیں دیا کیونکہ ان کی ذہنی تربیت اس انداز سے کر دی گئی تھی کہ معذوری کے باوجود ان کا جذبہ عزت نفس اور خودداری بہت بلند تھی۔ خلافت راشدہ دور نبوت کا ہی تسلسل اور تتمہ ہے۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں معذوروں کے حقوق و تحفظ کا جو مزاج اور ماحول قائم ہو گیا تھا، خلافت راشدہ میں ہمیں اس کے عملی نظائر ملتے ہیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے کے باوجود صبح منہ اندھیرے مدینہ کی ایک ضعیف اور نابینا خاتون کے گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اگر کوئی ذمی نادار اور معذور ہو جاتا تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جاتا۔ حضرت عمرو بن طفیل رضی اللہ عنہ کا ہاتھ جنگ یمامہ میں کٹ گیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے معذوروں کی کفالت اور خدمت کے لیے سرکاری خدام مقرر کر رکھے تھے۔ یہ تمام حقوق بلالحاظ مذہب وملت مستحق عورتوں، مردوں اور بچوں کو حاصل تھے اور یہ حقوق ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کی عملی تفسیر تھے۔ چنانچہ اسلام میں ان افراد کے حقوق اور ان سے حسن سلوک مطالباتِ ایمان اور دین کا حصہ ہے اور مقاصد شریعہ میں تحفظ جان کا حق معذور افراد کے لیے بدرجہ اولیٰ ہے۔ ارکان اسلام کی بجاآوری میں بھی ان افراد کو رعایت دی گئی ہے۔ سیرۃ النبی میں ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ملتا

ہے:

"إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ ، فَإِنَّ فِيهِمْ الضَّعِيفَ وَالسَّقِيمَ وَذَا الْحَاجَةِ , وَإِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَا شَاءَ".[1]

"تم میں سے جو شخص نماز کی امامت کرائے اسے چاہیے کہ وہ مختصر اور نرم نماز پڑھائے کیونکہ اس کے پیچھے کمزور، بیمار اور بوڑھے افراد بھی ہوتے ہیں اور جو اپنی نماز پڑھ رہا ہو تو اسے جتنا چاہے طویل کر سکتا ہے۔"

اسی طرح فرضیت صوم کے حوالے سے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾[2]

"اور جو کوئی بیمار یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے۔ اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر تنگی نہیں چاہتا۔"

حج کے متعلق فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾[3]

"اور لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا اللہ کا حق ہے جو شخص اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔"

جہاد میں بھی معذور افراد کو استثنیٰ حاصل ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾[4]

"اندھے پر، لنگڑے پر اور بیمار پر جہاد میں شریک نہ ہونے میں کوئی گناہ نہیں۔"

---

[1] ۔ البخاري، ابو عبدالله، محمد بن اسماعيل، الجامع المسند الصحيح المختصر من أُمور رسول الله وسننه وايامه،دار السلام والنشر والتوزيع الرياض، 2000ء، كتاب الأذان، باب إذا صلى لنفسه، رقم الحديث: 703

[2] ۔ البقرة2 : 185

[3] ۔ آل عمران 3: 97

[4] ۔ النور 24: 61

یہ تمام نصوص اور سنن و آثار معذور افراد کے تحفظ کے لیے اسلامی ریاست کی مستقل پالیسی کا حصہ ہیں اور ایسے افراد کے تحفظ و کفالت کے لیے ریاست کی آئینی و دستوری ذمہ داری کو ظاہر کرتی ہیں۔ چنانچہ خیر القرون میں ان افراد کو مستقل بنیادوں پر تحفظ دیا جاتا تھا اور ان کی بحالی کے لیے بھی لائحہ عمل مرتب کیا جاتا تھا۔ عصر حاضر میں ان کے نفاذ اور اطلاق سے ایسے خصوصی افراد کو وہ تمام حقوق حاصل ہو سکتے ہیں جو عقل و شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔

اسلام دین انسانیت ہے۔ بیماروں اور معذور افراد کے حقوق شرف انسانیت کے اسلامی تصور کا حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾[1]

"بے شک ہم نے انسان کو بڑے عمدہ انداز میں پیدا کیا ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾[2]

"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی۔"

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی شرف انسانی کی اہمیت کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"فإن الله خلق آدم على صورته"[3]

"یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔"

---

1 - التين 95: 4

2 - الإسراء 17: 70

3 - مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، صحيح مسلم، الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهى عن ضرب الوجه، رقم الحديث: 2612

اسی طرح اسلام کی سماجی تعلیمات میں شرف انسانیت کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ معذور اور بیمار افراد بھی صرف صحت اور قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ شرف انسانی سے نہیں، اس لیے ایسے خصوصی افراد کے حقوق کو اسلام نے بہت زیادہ وضاحت اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی عملی صورت ہمیں سیرت النبی ﷺ میں نظر آتی ہے۔

معذور افراد کی تعریف

فی زمانہ معذور افراد کی عزت نفس کی بنا پر انہیں معذور کہنے کی بجائے خصوصی افراد کہا جاتا ہے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور زندگی کی جدوجہد میں وہ اپنا حصہ ڈال سکیں۔ معذور کا لفظ عذر سے بنا ہے۔ اس سے مراد ناچار، مجبور، بے بس، بے دست ایسے افراد ہیں جو کسی ذہنی، جسمانی یا نفسیاتی کمزوری کی بنا پر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ معذور کے ایک معنی قابل معافی کے ہیں کیونکہ ایسے افراد کو عقل و شریعت میں بعض فرائض سے معاف رکھا گیا ہے اس لیے انہیں معذور کہا جاتا ہے۔[1]

اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"عذر سے مراد وہ علت ہے جس کی بنا پر کوئی شخص شرعی حکم بجالانے سے معذور سمجھا جائے جیسے بیمار، مسافر، اپاہج۔"[2]

یہ عذر پیدائشی یا حادثاتی طور پر ہو سکتا ہے۔ معذوری یا بیماری دائمی بھی ہو سکتی ہے اور عارضی بھی۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بیماری کی تعریف یہ کی گئی ہے:

"اگر کوئی شخص اپنی عمر اور جنس کے مطابق اپنے ذاتی اور سماجی کردار کے حوالے سے معمول کے مطابق اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا تو اسے بیمار سمجھا جاتا ہے۔"

W.H.O نے صحت کی تعریف میں لکھا ہے:

"مکمل جسمانی، ذہنی اور سماجی بہتری کی حالت نہ کہ صرف بیماری اور معذوری کا فقدان۔"

---

[1] ۔ مولوی، فیروزالدین، جامع فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور، 1983، ص: 123، ڈاکٹر، عبدالرؤف، جدید تعلیمی نفسیات، فیروز سنز لاہور، ص:27

[2] ۔مولوی محبوب عالم، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، 1992ء، ص:497

برطانوی قانون میں معذور افراد سے متعلق کہا گیا ہے:

"Impairment which has a substantial and long term adverse effect on a person's ability to carry out normal day to day activities."[1]

"یعنی ایک ایسا جسمانی یا دماغی عارضہ جو انسان کے روزانہ کے معمولات زندگی انجام دینے کی اہلیت وصلاحیت پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرے۔"

بیماری اور معذوری زندگی کے ایسے ناگزیر حوادث ہیں جن کے متعلق قرآن حکیم نے بڑے تاکیدی اسلوب کے ساتھ اہل ایمان کو پیشگی ہی خبردار کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾[2]

"اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت، اور یہی ہدایت پانے والے ہیں۔"

اس آیت مبارکہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حیات انسانی ابتلاء مسلسل کا نام ہے۔ غالب نے اسی حوالے سے کہا تھا کہ

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

سیرت النبی ﷺ آج کی گلوبل دنیا میں بھی انسانیت کی مادی اور روحانی مکمل رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس

---

[1] -UK Diabbility Discrimination Act,Nov 1995, Defination clause

[2] ۔ البقرة 2: 155

لیے بیمار اور معذور افراد کے حقوق کو بھی رسول کریم ﷺ نے اپنے قول، فعل اور تقریر میں نمایاں کیا اور اللہ رب کائنات نے جو صحیفۂ انسانیت آپ ﷺ پر نازل کیا اس میں بڑی جامعیت اور حکمت کے ساتھ معاشرے کے خصوصی افراد کے قانونی اور اخلاقی حقوق کو اصولی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

ضوابط معذور و بیمار

اسلام نے بیمار اور معذور افراد کے لیے ضوابط مقرر کیے ہیں۔ قرآن حکیم نے بیمار اور معذور افراد کے مالی استحقاق کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾[1]

"خیرات ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں رکے ہوئے ہیں ملک میں چل پھر نہیں سکتے۔"

دوسرا ضابطہ جو اس ضمن میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پر اس کی صحت، صلاحیت اور ہمت کے بقدر ہی فرائض عائد کیے گئے ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾[2]

"خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

جہاں تک ضابطۂ یسر کا تعلق ہے تو تمام انسانیت کے لیے بالعموم اور بیمار اور معذور افراد کے لیے بالخصوص اللہ تعالیٰ نے سہولت اور نرمی کا ضابطہ مقرر فرمایا ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾[3]

"اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے، اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے۔"

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ

---

[1] ۔ البقرة2: 273

[2] ۔البقرة2: 286

[3] ۔النساء4: 28

حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[1]

"ضعیفوں اور مریضوں پر اور ان لوگوں پر جو نہیں پاتے جو خرچ کریں کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں، نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

احادیث مبارکہ میں بھی ایسے افراد کی خدمت، دلجوئی اور ہر طرح کی نصرت و اعانت کی ترغیب دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے

"حق المسلم على المسلم خمس رد السلام وعيادة المريض واتباع الجنائز واجابة الدعوة وتشميت العاطس"[2]

"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی تیمار داری کرنا، جنازہ میں شریک ہونا، دعوت قبول کرنا اور چھینک کا جواب دینا۔"

آپ ﷺ کو ان خصوصی افراد سے وہ قلبی لگاؤ تھا کہ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ابْغُونِي الضُّعَفَاءَ، فَإِنَّمَا تُرْزَقُونَ وَتُنْصَرُونَ بِضُعَفَائِكُمْ"[3]

"مجھے کمزوروں میں تلاش کرو۔ اس لیے کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہیں روزی ملتی ہے اور تمہاری مدد ہوتی ہے۔"

غزوہ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ نے عذر کی بنیاد پر پیچھے رہنے والوں سے متعلق فرمایا:

"ان اقواما بالمدينة خلفنا ما سلكنا شعبا ولا واديا الا وهم معنا فيه حبسهم

---

[1] ۔ التوبہ9: 91

[2] ۔ صحيح البخارى، رقم الحديث: 1240

[3] ۔ أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي السِّجِسْتاني (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داود، الناشر: المكتبة العصرية، صيدا – بيروت، كتاب الجهاد، باب في الانتصار برذل الخيل والضعفاء، رقم الحديث: 2594

العذر"[1]

"مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو سفر تبوک میں تمہارے ساتھ نہیں لیکن ہم جو وادی اور گھاٹی عبور کرتے ہیں اس میں ان کا بھی اجر ہے کیونکہ معذوری نے انھیں سفر جہاد سے روکا ہے۔"

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے خصوصی افراد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کس قدر لطف و کرم ہے اور اسلامی معاشرے میں ان کی کس قدر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

انسان کی طبعی، جسمانی اور اتفاقی کمزوری کی بنا پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ایسے معذور، مجبور اور بیمار افراد کے ساتھ نرمی اور سہولت کے ضابطے عطا کرتے ہیں چناچہ خصوصی افراد کے حقوق اور تحفظ کے لیے یہ آیات اور احادیث مبارکہ نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں۔ذیل میں سیرۃ النبی ﷺ کی روشنی میں ایسے افراد کے حقوق کو بیان کیا جاتا ہے:

حق خدمت

بیمار اور معذور افراد ہمیشہ خصوصی توجہ اور خدمت کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کی خدمت اور سہولت کو دراصل اللہ تعالیٰ اپنی خدمت قرار دیتے ہیں ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

" إنَّ اللَّهَ عزَّ وجلَّ يقولُ يومَ القِيامَةِ: يا ابْنَ آدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي، قالَ: يا رَبِّ كيفَ أعُودُكَ؟ وأَنْتَ رَبُّ العالَمِينَ، قالَ: أما عَلِمْتَ أنَّ عَبْدِي فُلانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ، أما عَلِمْتَ أنَّكَ لو عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ؟ يا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي، قالَ: يا رَبِّ وكيفَ أُطْعِمُكَ وأَنْتَ رَبُّ العالَمِينَ؟ قالَ: أما عَلِمْتَ أنَّه اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلانٌ، فَلَمْ تُطْعِمْهُ؟ أما عَلِمْتَ أنَّكَ لو أطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذلكَ عِندِي، يا ابْنَ آدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ، فَلَمْ تَسْقِنِي، قالَ: يا رَبِّ كيفَ أسْقِيكَ وأَنْتَ رَبُّ العالَمِينَ؟ قالَ: اسْتَسْقاكَ عَبْدِي فُلانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ، أما إنَّكَ لو سَقَيْتَهُ وجَدْتَ ذلكَ عِندِي."[2]

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا تو تُو میری عیادت کو نہ آیا۔ ابن

---

[1] ۔ صحيح البخاری، رقم الحديث: 470

[2] ۔ صحيح مسلم، كتاب العيادة، باب قول الله تعالى ياابن آدم---، رقم الحديث:2569

آدم جواب دے گا: پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا جبکہ تُو سارے جہانوں کا آقا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تُو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھے کھانا کھلانے کو کہا تو تُو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اسے کھانا کھلایا ہوتا تو اس کو میرے پاس پا لیتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا تو تُو نے مجھے پانی بھی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی درخواست کی تھی تو تُو نے اسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔"

بیماروں اور معذوروں کی خدمت قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے اور اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر قرض قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾[1]

"ایسا کون شخص ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے پھر اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر دے، اور اللہ ہی تنگی کرتا ہے اور کشائش کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ﴾[2]

"ایسا کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے پھر وہ اس کو اس کے لیے دگنا کر دے اور اس کے لیے عمدہ بدلہ ہے۔"

---

[1] ۔ البقرة2: 254

[2] ۔ الحدید 57: 11

حق عیادت

بیماروں اور معذور کی عیادت نبی کریم ﷺ کی مستقل سنت ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے جو شخص بیمار کی عیادت کرے اس کے حق میں ملائکہ دعا گو رہتے ہیں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

"اطعموا الجائع وعودوا المريض" [1]

"بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور مریض کی عیادت کرو۔"

بیمار آدمی کی عیادت میں مسلم اور غیر مسلم، رشتہ دار یا غیر رشتہ دار میں کوئی فرق نہیں۔ آپ ﷺ یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے ساتھ چلو، ہم اپنے یہودی ہمسائے کی عیادت کرنا چاہتے ہیں۔ بریدہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ [2]

حق دعاء

مریض اور معذور آدمی عموماً طبیعی طور پر رقیق القلب اور شفیق المزاج ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ جب بھی مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس کے حق میں دعا فرماتے۔ بعض احادیث میں یہ الفاظ ملتے ہیں "بسم الله ارقيک، الله يشفيک من كل داء ما فيک" "میں تجھے اللہ کے نام سے دم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہر اس بیماری سے شفا دے جو تجھے لاحق ہے۔"

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا عَادَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِي خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتَّى يَرْجِعَ»، قِيلَ: "يَا

---

[1] ۔ صحيح البخاری، كتاب الجهاد والسير، باب فكاك الأسير، رقم الحديث: 3046

[2] - أحمد بن محمد بن إسحاق بن إبراهيم بن أسباط بن عبد الله بن إبراهيم بن بُدَيْح، الدِّيْنَوَرِيُّ، المعروف بـ «ابن السُّنِّي» (المتوفى: 364هـ)، عمل اليوم والليلة سلوك النبي مع ربه عز وجل ومعاشرته مع العباد، الناشر: دار القبلة للثقافة الإسلامية ومؤسسة علوم القرآن - جدة / بيروت، باب ما يقول لمرضى أهل الكتاب، رقم الحديث: 554

رَسُولَ اللَّهِ: وَمَا خُرْفَةُ الْجَنَّةِ؟"، قَالَ: «جَنَاهَا»." [1]

"بے شک مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو اس کے وہاں سے واپس ہونے تک وہ جنت کے خُرفہ میں رہتا ہے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! خرفہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے پھل۔"

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

"أَذْهِبِ البَاسَ رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لاَ شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لاَ يُغَادِرُ سَقَمًا."[2]

"اے لوگوں کے رب! بیماری دور فرما۔ شفاء دے دیجیے۔ آپ ہی شفاء دینے والے ہیں۔ آپ کے سوا کہیں شفاء نہیں۔ آپ مرض سے نجات عطا فرما دیجیے۔"

آپ ﷺ مریض کو یہ دعا بھی تلقین فرمایا کرتے تھے:

"اللهم عافنی فی بدنی، اللهم عافنی فی سمعی، اللهم عافنی فی بصری، لا اله الا انت" [3]

"اے اللہ! میرے (پورے) وجود کو تندرست کر دیجیے۔ اے اللہ! میرے کانوں کو صحت مند بنا دیجیے، اے اللہ! میری آنکھوں کو شفاء بخش دیجیے۔ بلاشبہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

حق علاج

بیمار اور معذور لوگوں کا بروقت اور مکمل علاج ان کا بنیادی حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"ان الله عزوجل لم ينزل داء الا انزل له شفاء، علمه من علمه وجهله من جهله." [4]

"اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری دنیا میں ایسی نہیں بھیجی جس کے لیے شفاء نازل نہ کی، لیکن بعض لوگ

---

[1] - صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل العيادة المريض، رقم الحديث: 2568

[2] - صحيح البخاري، كتاب المرضى باب دعا العائد للمريض، رقم الحديث: 5675

[3] - سنن أبي داود، كتاب الأدب، أبواب النوم، باب ما يقول إذا أصبح، رقم الحديث: 5090

[4] - احمد بن حنبل، مسند احمد، دار السلام للنشر والتوزيع الرياض، 2000ء: 411:2

اسے جانتے ہیں اور بعض نہیں جانتے۔"

شریعت اسلامی میں انسان کے حق زندگی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور تحفظ جان کو مقاصد شریعت میں شامل کیا گیا ہے۔ بیمار اور معذور لوگوں کے علاج معالجے کا بنیادی حق دراصل حق زندگی کا ہی تسلسل ہے اس لیے مایوسی یا بے دلی کی بجائے سیرت نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج کروانا مستقل سنت ہے اور آپ ﷺ نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

"تداووا يا عباد الله، فان الله عزوجل لم ينزل داء الا انزل معه شفاء الا الموت والهرم." [1]

" اے اللہ کے بندو! علاج کراؤ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے موت اور بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی شفاء بھی اتاری ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف مریض کو علاج کا بنیادی حق عطا کیا بلکہ آپ ﷺ نے غلط علاج اور ادویات کی شدید ترین الفاظ میں مذمت بھی فرمائی ہے کیونکہ علاج اگر غلط ہو تو بیماری اور معذوری میں افاقہ ہونے کی بجائے اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"من تطبب ولم يعلم منه الطب فهو ضامن." [2]

"طب کو اچھی طرح نہ جاننے کے باوجود جس نے علاج کیا تو وہ کسی بھی نقصان کا ضامن (ذمہ دار) ہو گا۔"

بیمار اور معذور افراد کے حق علاج کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ طبی علوم کو ترقی دی جائے اور نئی بیماریوں کے حملہ آور ہونے کے ساتھ طریقۂ علاج کو بھی ترقی دی جائے۔ بہترین، باصلاحیت اور بااخلاق ڈاکٹر پیدا کرنا، اعلیٰ ترقی یافتہ شفاء خانے قائم کرنا، ان کو فنڈنگ اور تمام ضروری سہولیات مہیا کرنا، یہ کسی بھی معاشرے اور ریاست کے لیے زندگی اور موت کا چیلنج ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سیرت النبی کے اندر ماہر اطباء کی تیاری اور علاج معالجے کی سہولیات کی فراہمی ریاست مدینہ میں ہمیں عملاً نظر آتی ہے۔

---

[1] مسند احمد، 327:4

[2] ابو داؤد، كتاب الديات، باب فيمن تطبب بغير علم، رقم الحديث:4586

آج کے گلوبلائزڈ دور میں عالمی سطح پر تدارک امراض اور صحت کے حصول کے لیے جو کوشش ہو رہی ہے آج کی جدید اسلامی ریاست اسوہ حسنہ کی روشنی میں ان تمام معاملات میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی پابند ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے حصول علم کے لیے جو ارشادات فرمائے، ان میں علم طب سمیت تمام مفید علوم شامل ہیں۔ حصول ترقی اور معاشرے پر اس کے عملی اثرات مرتب ہونا اور درجہ بدرجہ نسل در نسل ان کا منتقل ہونا یہ تمام اعلیٰ اقدار بیمار اور معذور افراد کے حقوق علاج کے ضمن میں مستقل طور پر شامل ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"عن انسؓ قال قال رسول اللهﷺ من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع." [1]

"حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ جب تک گھر واپس نہ آئے، اللہ کے راستے میں ہے۔"

نیز فرمایا:

"عن انس قال قال رسول اللهﷺ طلب العلم فریضة عل کل مسلم." [2]

"حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حصول علم ہر مسلمان پر واجب ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان تمام مفید علوم میں علم طب بھی شامل ہے اور امت کو اپنے تمام گروہی، مسلکی، مذہبی، وطنی، علاقائی، اور لسانی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انسانیت کے اس اہم ترین شعبے میں مقلدانہ روش چھوڑ کر قائدانہ کردار ادا کرنا ہے۔ یہ اس کے امت وسط اور امت خیر ہونے کا بنیادی تقاضا ہے جس کے ادراک و شعور سے ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی نظام ہائے تعلیم دونوں ہی شعوری طور پر نابلد ہیں۔ آپ ﷺ نہ صرف علوم مفیدہ کی دعا مانگتے تھے بلکہ علوم غیر مفیدہ سے پناہ بھی مانگتے تھے۔ ایک دعا کے الفاظ ہیں:

"اللهم انی اعوذ بک من علم لا ینفع." [3]

"اے اللہ! میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو غیر نافع ہو۔"

---

[1]- ترمذی، ابو عیسی، محمد بن عیسی، جامع، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، 2000ء، کتاب العلم باب فضل طلب العلم، رقم الحدیث: 2647

[2]- ابن ماجة، باب فضل العلما، رقم الحدیث: 224

[3]- صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل، رقم الحدیث: 2722

مریض کا حق علاج سیرت طیبہ میں اس قدر شرح وبسط سے بیان ہوا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جس طرح نماز کے لیے وضو ضروری ہے اسی طرح مریض کے اس حق علاج کے لیے ادویہ سازی، ان کی بروقت فراہمی اور شعبۂ طب میں ایک نائب قاصد سے لے کر سیکرٹری صحت تک سچے مسلمان، سچے پاکستانی، کامل اہلیت رکھنے والے اور انسانیت کا درد رکھنے والے سرکاری ملازمین کا میرٹ پر تقرر بھی ایک لازمی امر ہے۔ اس لیے اصولی اور بنیادی طور پر آنحضرت ﷺ نے ہر اس شخص کو جنت کی خوش خبری دی ہے جو ایسے معذور اور بیمار افراد کی کفالت کرنے والا ہو۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"الساعی علی الارملة والمسکین کالساعی فی سبیل الله واحسبه قال کالقائم لایفتر وکالصائم لا یفطر." [1]

"بیوہ اور یتیم کی خدمت میں کوشش کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا اور ایسا ہے جیسے کوئی دائم الصلاۃ اور دائم الصوم ہو۔"

حق خیر خواہی

اسلام بھلائی اور خیر خواہی کا دین ہے اور ہر حال میں خلقت کے ساتھ بھلائی کی تلقین کرتا ہے خصوصاً معذور، کمزور اور بیمار افراد کے ساتھ جذبہ خیر خواہی سیرت النبی میں سمندروں اور طوفانوں کی طرح برق رفتار نظر آتا ہے۔ حضرت ابو رقیہ تمیم بن اوس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

"الدین النصیحة قلنا: لمن؟ قال: لله عزوجل ولکتابه ولرسوله ﷺ ولائمة المسلمین وعامتهم." [2]

"آنحضرت ﷺ نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا: کس کی خیر خواہی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب اور رسول ﷺ کی، مسلم حکمرانوں کی، اور تمام مسلمانوں کی۔"

یہی دین کی اصل روح ہے۔ اسلام تمام مسلمانوں کے لیے عمومی حالات میں خیر خواہی کا درس دیتا ہے تو خصوصی افراد کے لیے عقل اور شریعت کی رو سے یہ خیر خواہی اور بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ مستحق، معذور، بیمار،

---

[1] ۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب الإحسان إلى الارملة والمسكين واليتيم، رقم الحديث: 2982

[2] ۔ ایضا، رقم الحدیث: 55

مجبور، تنگ دست، بے سہارا، بے وسیلہ، بے زر و مال، بے گھر و عیال جیسے مستحق افراد کے لیے خیر خواہی بدرجہ اتم لازم ہے۔ اس خیر خواہی کی نہ کوئی حدود ہیں اور نہ وقت مقرر ہے اور نہ ہی اس میں نسل، رنگ اور مذہب کا امتیاز ہے۔ معذور افراد جیسے بھی ہوں، ہر حال میں ان کی خیر خواہی ان کا بنیادی حق ہے اور معاشرے کا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے۔ جیسا کہ اس حدیث سے رہنمائی ملتی ہے:

"عن ام منذر قالت: دخل عليّ رسول اللهﷺ ومعه علي ولنا دوال معلقة فجعل رسول اللهﷺ ياكل ومعه علي ياكل، فقال رسول اللهﷺ لعلي: مه مه يا علي، فانک ناقه، قال: فجلس علي والنبیﷺ ياكل۔ قالت: فجعلتُ لهم سلقا وشعيرا فقال النبیﷺ: يا علي، من هذا فاصب، فانه اوفق لک." [1]

"حضرت ام منذر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ہمارے ہاں کھجور کے خوشے لٹک رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں نے کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم تو ابھی بیماری سے اٹھے ہو، بیٹھ جاؤ۔ ام منذر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے اور آپ ﷺ کھاتے رہے۔ پھر میں نے ان کے لیے چقندر اور جَو تیار کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: علی! اس میں سے لے لو یہ تمہاری طبیعت کے مطابق ہے۔"

اس حدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ بیمار شخص کو ایسی غذا دینی چاہیے جو اس کے لیے مفید ہو۔

پاکیزہ ماحول کی فراہمی

بیمار اور کمزور لوگوں کو پاکیزہ ماحول فراہم کرنا ان کا بنیادی حق ہے۔ اسلام نے عقائد کے بعد سب سے زیادہ زور طہارت پر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "الطهور شطر الايمان" اور "والله يحب المطهرين" ان پاکیزہ تعلیمات کی رو سے کوڑا کرکٹ، استعمال شدہ پانی، کارخانوں اور ٹریفک کا غلیظ دھواں، صنعتی طبی آلودگی، ملاوٹ شدہ خوراک، انسانی، حیوانی، طبی، صنعتی زرعی فضلہ، فضائی آلودگی، سمندری، جنگی، زمینی آلودگی یہ تمام مسائل تندرست اور صحت مند آدمی کے لیے موت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بیماروں اور معذوروں کو تو بدرجہ اتم ان سے

---

[1] - جامع الترمذي، ابواب الطب، باب ما جاء فی الحمية رقم الحديث: 2037

بچانا عقلاً اور شرعاً واجب ہے۔ ان تمام کثافتوں اور غلاظتوں سے دائمی طور پر ایسے افراد کو بچانا ریاست کے فرائض میں شامل ہے اور عام شہری اپنے دائرہ کار کے اندر اس کے مکلف ہیں۔

سیرت النبی ﷺ میں اس سے متعلق بنیادی ہدایات ملتی ہیں۔ کتاب الطہارت میں پانی کی مختلف اقسام پر اعلیٰ علمی مباحث موجود ہیں اور مجموعی طور پر تمام آلودگیوں سے پاک معاشرہ قائم کرنا انسانیت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے اور فی زمانہ انسانیت کے لیے چیلنج بن چکا ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"مفتاح الصلوة الطهور [1]

"طہارت نماز کی کنجی ہے۔"

آپ ﷺ نے راستوں میں، سایہ دار درختوں میں، نہروں، اور دریاؤں میں قضائے حاجت سے منع فرمایا کیونکہ عموماً یہ چیزیں انسانوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ حاجت کے بعد مٹی کے ڈھیلوں کا استعمال ایک جراثیم کش عمل ہے۔ آپ ﷺ نے مٹی اور پانی دونوں سے طہارت کا حکم دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"خرج النبی ﷺ لحاجته فقال: التمس لي ثلاثة احجار." [2]

"حضور ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے لیے مٹی کے تین ڈھیلے تلاش کرو۔"

کتب احادیث میں طہارت و صفائی کے ضمن میں ایسے شاندار اور بلیغ ابواب باندھے گئے ہیں جن پر عمل کر کے ہم تمام آلودگیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، خصوصاً ہم اپنے بیماروں، کمزوروں اور معذوروں کو صحت جیسی نعمت سے مستفید کر سکتے ہیں۔ مثلاً باب ماجاء اذا استيقظ احدكم من منامه فلا يغمسن يده فى الاناء حتى يغسلها یعنی جو آدمی سو کر اٹھے وہ ہاتھ دھوئے بغیر کسی پانی کے برتن یا قابل استعمال چیز کو ہاتھ دھوئے بغیر استعمال نہ کرے۔ اسی طرح باب ماجاء فى كراهة البول فى المغتسل یعنی نہانے کی جگہ قضائے حاجت کی ممانعت کا باب۔ چنانچہ ان خصوصی افراد کا بھی یہ حق ہے کہ انہیں بیماری اور آلودگی سے پاک ماحول دیا جائے۔

---

[1] - سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 61

[2] - جامع الترمذی کتاب الطہارہ، رقم الحديث: 155

فوری طبی امداد کا حق

انسانی زندگی ہر وقت خطرات اور مصائب و آلام میں گھری رہتی ہے۔ کسی وقت کوئی عذر کسی شخص کو کسی جگہ بھی پیش آسکتا ہے، لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ حادثات کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کیے بغیر ان سے بچاؤ کی پیشگی منصوبہ بندی کی جائے۔ تمام سرکاری، نیم سرکاری، غیر سرکاری اداروں، گلی محلوں، پارکوں، ہوائی اڈوں، ہوٹلوں، دفتروں، مارکیٹوں، تعلیمی اداروں، عبادت گاہوں، دارالامانوں، عام گزر گاہوں غرضیکہ ہر جگہ پر فوری طبی امداد کے انتظامات ہونا ان خصوصی افراد کا خصوصی حق ہے اور مجموعی طور پر ہر ذی جان کا یہ حق ہے کہ اچانک حادثات کے موقع پر ہسپتالوں تک رسائی سے پہلے انھیں طبی امداد فراہم کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾[1]

"جس نے ایک شخص کی جان بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔"

سیرت النبی ﷺ کی رو سے اس قسم کے فلاحی کام نصرت الٰہی کے حصول کا مستقل ذریعہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

"والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه."[2]

"اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا

"خير الناس من ينفع الناس"[3]

"بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کے لیے فائدہ مند ہو۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"الخلق عيال الله"[4]

---

[1] ۔المائدہ5: 32

[2] ۔صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، رقم الحديث: 2699

[3] ۔ مالک بن انس، امام، مؤطا، دار احياء التراث العربی، 1406ھ، كتاب العلم: 516:1

[4] ۔ شعب الإيمان، رقم الحديث: 7045

"تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔"

ایک حدیث میں فرمایا:

"ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء." [1]

"تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

یہ تمام پاکیز تعلیمات اپنے اندر ابتدائی طبی امداد جیسی نفع رسانی کو بھی بیان کرتی ہیں۔ اس کا عملی نظام ریاست مدینہ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا سر جن صحابیہ تھیں۔ ان کا ایک مستقل کیمپ مسجد نبوی میں قائم رہتا تھا جس میں مستحق لوگوں کا علاج معالجہ فوری طور پر کیا جاتا تھا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے:

"فکانت تداوی الجرحی وتحتسب بنفسها علی خدمة من کانت به ضیعة من المسلمین وکان رسول الله یمر بها فیقول:کیف امسیت؟ وکیف اصبحت؟ فتخبره" [2]

"آپ زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور مسلمانوں میں سے جو بھی بیمار ہوتا، ان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب وہاں سے گزرتے تو ان کی صبح و شام خیریت دریافت کرتے۔"

حق سہولت

قرآن حکیم میں بھی بیمار آدمی کی سہولت کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے روزہ، حج جیسے ارکان اسلام کی ادائیگی میں بھی بیمار اور معذور آدمی کو سہولیات عطا کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ [3]

"نہ تو اندھے پر گناہ ہے (کہ سفر جنگ سے پیچھے رہ جائے) اور نہ لنگڑے پر گناہ ہے اور نہ بیمار پر گناہ ہے۔"

---

[1] ۔ مستدرك حاكم، 277:4

[2] ۔ ابن ہشام، 250:3

[3] ۔ الفتح 48: 17

یہ آیت مبارکہ مریضوں اور کمزوروں کے حق سہولت پر نص قطعی ہے خود رسول اللہ ﷺ کو ایسے خصوصی افراد کا اتنا خیال اور احترام رہتا تھا کہ آپ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی تشریف آوری پر کھڑے ہو جایا کرتے تھے کیونکہ سورۃ عبس میں اللہ تعالی نے ان کے عذر کی مجبوری اور ان کے ایمان کی پختگی کی شہادت دی ہے۔اس طرح کسی طور پر بھی کسی مرحلے پر بھی ایسے خصوصی افراد کے خصوصی، عمومی، فوری، انسانی، قانونی، اخلاقی حقوق کو قرآن وسیرت میں کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ اس کو نظر انداز کرنے والے افراد کی گرفت کی ہے۔

ان تفصیلی حقوق کے ساتھ ساتھ سیرت النبی ﷺ کی رہنمائی میں ہمیں بعض اور حقوق بھی ملتے ہیں۔خوف طوالت کی وجہ سے ان کی وضاحت کی بجائے صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔مثلا محکمہ صحت میں پائی جانے والی تمام خرابیوں کی اصلاح بذریعہ قانون و اخلاق مثلاً ادویات، سامان سرجری اور معذوروں، بیماروں کے زیر استعمال اشیاء کی فوری اور مناسب داموں پر فراہمی، ڈرگ کورٹس کی رفتار کار کی اصلاح، حفظان صحت کے اسلامی اصولوں کے شعور و فروغ کے لیے نجی اور سرکاری اداروں کا قیام، منشیات پر پابندی اور وہ تمام ترجیحی حقوق ایسے افراد کو حاصل ہیں جو موقع محل کی مناسبت سے ضروری ہوں۔ان حقوق کی ادائیگی کو یقینی بنانا فرد سے لے کر ریاست تک ہر بشر اور ہر ادارے کا بنیادی فرض ہے اور مسلم معاشرے کی تو یہ مستقل پہچان ہے۔اس میں موبائل شفاء خانوں کے قیام کو یقینی بنانا بھی شامل ہے۔موجودہ دور میں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ حکمرانوں کو بھی اپنا علاج معالجہ عوامی ہسپتالوں میں کرانا چاہیے تاکہ وہ انتظامیہ پر نظر رکھ سکیں اور عوام کی مشکلات کا انہیں احساس ہو۔سرکاری ملازمتوں میں بھی ایسے افراد کا خصوصی کوٹہ ہونا چاہیے جس میں میرٹ پر ان کی تعیناتی ہو۔سورۃ توبہ کی آیت نمبر 92،91 بھی ان تمام حقوق کی تائید کرتی ہے۔

نتائج وسفارشات

سیرت النبی ﷺ میں پیدائشی اور حادثاتی معذوروں اور بیماروں کے تمام بنیادی انسانی، طبی حقوق سے متعلق احکامات، مسنون اعمال اور روشن مثالیں ملتی ہیں جن کو ان کی اصل روح کے ساتھ عصر حاضر میں اپنانے کی ضرورت ہے۔عذر کی بنا پر حاصل ہونے والے حقوق مستقل حقوق ہیں۔ریاست کا کوئی ادارہ یا کوئی فرد ان حقوق میں کمی نہیں کر سکتا۔ان حقوق کے ساتھ ساتھ ان خصوصی افراد کے اندر ان کے حقوق سے متعلق شعور و آگاہی

پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ تمام عمارتوں کی تعمیر، عوامی مقامات پر ان افراد کی آمد و رفت کے لیے خصوصی انتظامات ہونے چاہئیں۔ ان کے لیے جائے حاجت، ویل چیئرز کا انتظام، برقی، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا پر ان کے حقوق کے تحفظ اور شعور و آگاہی کے لیے مستقل بنیادوں پر پروگرام نشر کیے جائیں۔ مساجد کی تعلیم، عیدین اور جمعے کے خطبات، جنازوں کے اجتماعات اور تہواروں کے مواقع پر ان افراد کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ ایسے مواقع پر ان کے حقوق پر روشنی ڈالی جائے اور اس جذبے کو زندہ رکھنے کے لیے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا جائے اور ہر وہ عمل اپنایا جائے جو موقع محل کی مناسبت سے ضروری ہو۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾[1]

"اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔"

تعلیمی اداروں اور کھیلوں میں ان کا خصوصی کوٹہ ہو، امور خانہ داری میں بھی ان سے مشاورت ہو اور بوقت ضرورت ان کو خصوصی امداد دی جائے اور انہیں خصوصی الاؤنس مہیا کیا جائے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾[2]

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا تھا۔"

---

[1] الحشر 59: 9

[2] ۔ الذاریات 51: 91

نکاح میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل

(سیرت طیبہ کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد ارشد*

سدرہ فردوس**

ABSTRACT

Islam considers marriage as one of the most virtuous and approved institution. Keeping in view importance of Nikah, Islam has tried to make marriage simple and easy. But in Pakistani society materialistic thinking, lavish expenses on marriage, unwanted customs and idealism has made marriage a herculean task. Due to unemployment, caste clergy, wrong interpretation of "Kufv", women economic independence, completion of higher education, look after of old parents, responsibilities of young brothers and sisters, dislike for second marriage of widow and divorced, to avoid property distribution or presence of any medical complications late and delayed marriages have become practice of the day. Even some persons avoid marriage and prefer to live an isolated life. This paper is a study of the solution of these hurdles in the light of Seerah.

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

** ایم فل سکالر، علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس بنیادی اکائی کی نمو رشتہ زوجیت سے ہے۔ تخلیق انسانی کے ساتھ ہی اس رشتے کا آغاز ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کی زوجیت کا معاملہ ہوا۔ نکاح تمام انبیاء اکرام کی سنت بھی ہے۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سنت کو اختیار کیا اور ایک صحابی کے اس اعلان پر کہ مَیں کبھی شادی نہیں کروں گا آپ نے فرمایا کہ:

"من أعرض عن سنتي فليس مني."[1]

"جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔"

مگر مشرق و مغرب میں خواتین و حضرات میں نکاح نہ کرنے کا رجحان دن بدن فروغ پا رہا ہے جس سے خاندان کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ مشرق میں اس تبدیلی اور مغربی اقدار کی پیروی کو روشن خیالی اور آزادئ نسواں سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ دیگر مسلم ممالک کی طرح پاکستان میں بھی نکاح میں تاخیر کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ 1997ء کی مردم شماری کے مطابق شادی شدہ افراد کا تناسب 63% تھا لیکن 2017ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق شادی شدہ افراد کا یہ تناسب نہ صرف کم ہوا ہے بلکہ ان اعداد و شمار کے مطابق نکاح کی عمر میں تاخیر کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈان نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق:

> Although 2017 results have yet to be completely collated and released, well-placed sources claim that the percentage of married people has gone down. The average age at which people are getting married has also gone up significantly, particularly among young women.[2]

مردوں اور بالخصوص خواتین میں نکاح کی اوسطاً عمر میں اضافہ ہوا ہے۔ Population Council کی ایک تحقیق کے مطابق 1975ء سے 2013ء کے درمیان خواتین میں نکاح کی اوسط عمر 17 سے 19 سال رہی جبکہ 1991ء سے 2013ء کی دہائیوں میں یہ شرح لڑکیوں میں 21.5 سے 23.3 سال اور لڑکوں میں 26.5 اور 27.1 سال تک پہنچ گئی۔ رپورٹ کے مطابق شادی کی عمر میں تاخیر کی وجہ سے مجرد افراد کی شرح

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم الحدیث:5063

[2] -https://www.dawn.com/news/1388758
Ahmed Yusuf ,Being Single In Pakistan, February 11, 2018, retrieved: MAY 22, 2019

میں بھی اضافے کا امکان ہے۔[1] نکاح کی عمر میں تاخیر یا نکاح سے انحراف ایک صحت مند رجحان نہیں ہے کیونکہ یہ معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کے خاتمہ اور معاشرے کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ نکاح میں تاخیر کے اس رجحان کے پس منظر میں بہت سے عوامل کار فرما ہیں۔ اس مقالے میں انہی عوامل اور نکاح میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کیا جائے گا اور اس کے بعد سیرت طیبہ کی روشنی میں ان رکاوٹوں کے حل کے حوالے سے لائحہ عمل کا ذکر کیا جائے گا۔

1۔مادیت پسندی

پاکستانی معاشرہ میں نکاح میں بڑی رکاوٹ مادہ پسندی ہے۔ بے جا نمود و نمائش، فضول کی رسم و رواج، بے جا فضول خرچی اور اخراجات نے نکاح کو مشکل بنا دیا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ایک متوسط درجے کی شادی پر بھی اوسطاً پانچ سے دس لاکھ کا خرچ آرہا ہے۔[i] بہت سے افراد کا نکاح غربت اور معاشی وسائل کی کمی کی بنا پر تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق تقریباً 77% معاشی عوامل ہی نکاح میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں۔[2] جہیز کی ڈیمانڈ کے باعث بعض اوقات متوسط لوگوں کے لیے بھی بچیوں کے نکاح تاخیر کا شکار ہو رہے ہیں۔ جہیز کی لعنت ایسی ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں بھی اس کا تصور نہیں ہے۔ ہاں حضرت فاطمہؓ کے لیے چند ضرورت کی چیزیں دینے کا ذکر ہے لیکن اس سے موجودہ جہیز کا جواز درست نہیں ہے۔ اور ملکی قانون میں بھی اس کی حد مقرر کی گئی ہے۔

اسلام نے نکاح کے باب میں عورت کے مال، اس کے حسب، اس کے حسن و جمال اور دین میں سے آخری چیز کو مد نظر رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث پاک میں حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"تنكح المراة لاربع، لمالها و لحسبها و جمالها و لدينها فاظفربذات الدين تربت يداك"[3]

---

[1]- https://www.popcouncil.org/uploads/pdfs/2016PGY_YouthInPakistan.pdf Youth in Pakistan: Priorities, realities and policy responses,August 2016, byZeba A Sathar,Iram Kamran,Maqsood Sadiq,Sabahat Husnain ,pg,12-13, retrived: May 22, 2019

[2] - Hina Saleem,Late marriages and infertility :An Anthropological Analysis on Health, The Explorer Islamabad: Journal of Social Sciences,vol:1 issue 7: 246-250, retrieved: May 22, 2019

[3]-ایضاً، كتاب النكاح، باب الاكفاء فى الدين ، رقم الحديث: 5089

"عورت سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کے سبب، اس کے حسب کے سبب، اس کے جمال کے سبب اور اس کے دین کے سبب، سو تم دین والی عورتوں سے نکاح کرو، اے اللہ کے بندو!۔"

اگر کسی جگہ پر یہ چاروں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو یہ بہت ہی بہتر ہے مگر ان میں سے مال، حسب اور جمال کو پیش نظر رکھنا غلطی ہے بلکہ دین کو ترجیح دی جائے۔ دین کے بارے میں آگہی رکھنے والی اور اس پر عمل کرنے والی عورت سے نکاح کیا جائے۔ آج کے معاشرے میں ہماری ترجیحات تبدیل ہو گئی ہیں۔ ہمارے ہاں عورت کے مال و دولت اور اس کے حسن و جمال اور اس کے خاندان کو ترجیحات میں رکھا جاتا ہے اور اس کے دین اور کردار کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ مادیت پر مبنی اسی رویے کے باعث خواتین کے نکاح میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف سے بھی مادیت والا رویہ ہے کہ بچیوں کے لیے رشتے کی تلاش میں بھی مال و دولت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور باقی چیزوں کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔

2۔ مسئلہ کفو کی غلط تعبیرات

اسلامی تعلیمات میں میاں بیوی میں موافقت کے لیے کُفو (Equal social status) کا تصور ہے کہ میاں بیوی امارت، تعلیم، دین اور کردار میں ہم پلہ ہوں تاکہ ان کے اندر ہم آہنگی پیدا ہو لیکن یہ تو چیز نہ تو نکاح کے ارکان میں سے ہے اور نہ اس کی بنیادی شرائط میں سے۔ دین اور تعلیم میں ہم پلہ ہونا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے ہاں ذات برادری اور اپنے مسلک کے اندر شادی کرنے پر بہت سختی ہے جو کفو کی غلط تعبیر ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق تقویٰ کی بنیادی اہمیت ہے۔ قبائل و گروہ کا مقصد محض پہچان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾[1]

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم کو گروہوں اور قبیلوں میں بنایا تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ قبائل و گروہ محض پہچان و تعارف کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ عزت و توقیر کا باعث نہیں ہیں اس لیے نکاح میں ذات برادری پر بے جا اصرار مناسب نہیں۔ اسی طرح اپنے مسلک میں نکاح پر بھی اصرار

---

[1] ۔ الحجرات 13:49

نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ قرآن حکیم نے مشرک مرد اور عورت سے نکاح منع فرمایا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾[1]

"اور تم مشرک خواتین سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔"

اسی طرح خواتین کے لیے حکم دیا:

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾[2]

"اور تم مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔"

ان آیات میں مرد و عورت کو مشرک عورت و مرد سے نکاح سے روکا گیا ہے۔ دوسری طرح اہل کتاب (یہود اور نصاریٰ) کی خواتین سے مسلمان مردوں کی شادی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾[3]

"اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور تم سے پہلے اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی (حلال ہیں)۔"

چنانچہ آج کے دور میں کسی مسلک میں نکاح کو ناجائز قرار دینا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ذات برادری اور مسلک کی پابندی سے خواتین و حضرات کے نکاح میں تاخیر کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ان خود ساختہ پابندیوں سے آزاد ہونا ہوگا۔

3۔ آئیڈیل کی تلاش

آج کل خواتین و حضرات کے نکاح میں تاخیر کی ایک وجہ آئیڈیل کی تلاش بھی ہے۔ نکاح میں تاخیر کا سبب بننے والے عوامل میں تقریباً 62% حصہ اسی آئیڈیلزم (Idealism) کی تلاش کا ہے۔[4] مرد بھی آئیڈیل تلاش کرتا ہے کہ وہ عورت خوبصورت ہو، رنگ، قد، دبلا پتلا ہونا (سمارٹ ہونا)، نقوش بے مثال ہوں۔ اسی طرح وہ اعلیٰ

---

[1] ۔ البقرۃ2:221

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ المائدۃ5:5

[4] ۔ Hina Saleem,Late marriages and infertility :An Anthropological Analysis on Health, The Explorer Islamabad: Journal of Social Sciences,vol,1 issue (7): 246-250, retrived: MAY 22, 2019

تعلیم یافتہ ہو، ملازمت پیشہ ہو، اس کا خاندان اعلیٰ نسب کا حامل ہو، انتہائی مالدار ہو اور علم بھی کم ہو۔ صاف ظاہر کہ ان تمام صفات کی حامل خاتون کم ہی ملے گی اور یوں آئیڈیل کی تلاش میں مرد کا نکاح تاخیر کا شکار ہو جائے گا۔

اسی طرح عورت بھی آئیڈیل کی تلاش میں رہتی ہے کہ شوہر کا رنگ، قد و قامت، تعلیم یافتہ ہو، ملازمت یا بر سرِ روز گار ہو، کوٹھی بنگلے والا ہو، گاڑی ہو اور وہ اکیلا ہو (اس کے والدین، بہن بھائی کوئی نہ ہوں) یا اس کے والدین، بہن بھائی ہوں تو اس کی رہائش ان سے الگ ہو۔ ان صفات کے حامل شوہر کو تلاش کرتے کرتے کئی خواتین اتنی زیادہ عمر کی ہو جاتی ہیں کہ پھر وہ مجرد رہنے کو ہی اختیار کر لیتی ہیں۔ اور بعض نکاح کرنے کو ترجیح دیتی ہیں تو عمر کے حصے میں اس پر بھی اکتفا کر لیتی ہیں کہ وہ مرد ہو اور باقی آئیڈیل میں سے کوئی خصوصیت بھی نہ ہو۔ اور آئیڈیل کی تلاش کا ایک نقصان یہ ہے کہ اس سے نکاح میں تاخیر ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ آئیڈیل کی تلاش میں بعض اوقات خواتین و حضرات نکاح سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ بہت نیچے آکر نکاح کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نکاح کے باب میں آئیڈیل کی تلاش میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ کوئی شخص ساری خوبیوں کا جامع نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری بات یہ کہ بعض اوقات وقتی طور پر بعض چیزیں ناپسند ہوتی ہیں مگر انجام کار کے طور پر اس میں بہت زیادہ بھلائیاں ہو سکتی ہیں۔ اس حوالے سے قرآن حکیم نے ضابطے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾[1]

"قریب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائیاں رکھ دی ہوں۔"

اسی طرح حدیث پاک کی رو سے مال، جمال اور دین کی بناء بھی پر عورت سے نکاح کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں دین دار عورت سے نکاح کو ترجیح دینے کا حکم دیا گیا ہے۔[2]

لہٰذا بلاوجہ آئیڈیل کی تلاش میں نقصان ہی کا غالب امکان ہے۔

4۔ وراثت کی تقسیم سے گریز

خواتین کے نکاح میں تاخیر کی ایک اور وجہ وراثت کی تقسیم سے بچنا ہے۔ اگر شادی کر دی تو جائیداد تقسیم ہو جائے گی۔ اس لیے مختلف حیلے بہانوں سے شادی کو مؤخر کیا جاتا ہے یہاں تک کہ عمر اتنی زیادہ ہو جائے کہ بچی خود کہے کہ میں اب شادی نہیں کروں گی یا وہ اس عمر میں شادی تو کرنا چاہے مگر کوئی اور اس کے ساتھ شادی کو تیار نہ

---

[1] ۔ النساء 19:4

[2] ۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب النکاح، باب استحباب نکاح ذات الدین، رقم الحدیث:1444

ہو۔

اسی طرح بعض علاقوں میں وراثت کی تقسیم سے بچنے کی کوشش سے خواتین کی قرآن سے شادی کی رسم کو جنم دیا ہے تاکہ عورت کو اپنے ہی گھر میں رکھ لیا جائے۔ اس کے خلاف سزا تجویز کرتے ہوئے تعزیرات پاکستان سیکشن 498 میں کہا گیا ہے:

> Whoever compels or arranges or facilitates the marriage of a women with Holy Quran shall be punished with imprisonment of either description for a term may be extend to seven years or for a term which shall not be less than three years and shall also be liable to fine of five hundred thousand Rupees.{Pakistan Penal Code (PPC)}. [1]
>
> جو شخص کسی عورت کو قرآن سے شادی پر مجبور کرے یا اس کا انتظام کرے یا سہولیات فراہم کرے تو اس کو قید کی سزا دی جائے گی جس کی مدت زیادہ سے زیادہ سات سال تک اور کم سے کم تین سال ہو گی اور پانچ لاکھ جرمانے کو ادا کرنے کا ذمہ دار بھی ہو گا۔ اسی طرح تعزیرات پاکستان کے سیکشن 298A کے مطابق عورت کو کسی بھی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد یا وراثت سے محروم کرے تو ایسی صورت میں اسے دس سال کی سزا دی جا سکتی ہے لیکن پانچ سال سے کم نہ ہو یا دس لاکھ جرمانہ کی سزا دی جائے گی۔

خواتین کو قرآن سے شادی یا دیگر طریقوں سے وراثت سے محروم رکھنے کا معاملہ سندھ اور جنوبی پنجاب کے بعض علاقوں میں عورت کو بالواسطہ طور پر مجرد زندگی بسر کرانے کا طریقہ ہے۔

5۔ مطلقہ یا بیوہ کے عقد ثانی کو معیوب سمجھنا

ہندو معاشرے کے ساتھ صدیوں تک بود و باش رکھنے کی وجہ سے ابھی بھی ہمارے معاشرے میں مطلقہ یا بیوہ کے دوسرے نکاح کو معیوب گردانا جاتا ہے۔ عقد ثانی کا رجحان نہ ہونے کے سبب بیوہ اور طلاق یافتہ خواتین کی شرح میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ حالیہ ہونے والی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں بیوگان کی تعداد

---

[1]- Pakistan Panel Code (PPC)

40.5% ہے جبکہ 0.34 % خواتین طلاق یافتہ ہیں۔[1] یہ تعداد 1998ء کی مردم شماری کی بنسبت پانچ سے چھ گنا زیادہ ہے۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوہ یا مطلقہ کے عقد ثانی کا رجحان بڑھنے کی بجائے مزید کم ہوا ہے جبکہ اسلام مطلقہ اور بیوہ کے دوسرے نکاح کو جائز قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾[3]

"اور عقد نکاح کو پختہ نہ کرو یہاں تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔"

اس آیت میں عدت کے دوران عقدِ نکاح کو پختہ نہ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ نکاح کا جواز اس سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس آیت کے آغاز میں صرف دوران عدت اشارۃً پیغام نکاح کی ممانعت ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ﴾[4]

"تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم عورتوں کو اشارہ و کنایۃ میں پیغام نکاح دو۔"

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ جن خواتین سے سے نکاح کیا وہ یا تو مطلقہ تھیں یا بیوہ تھیں۔ اور ان میں سے کچھ جیسے حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہ بنت زمعہؓ تو آپ ﷺ سے بھی زیادہ عمر کی تھیں۔ قرآن حکیم کی واضح تعلیمات اور سیرت طیبہ کے بعد کون سی معاشرتی روایت ہے جو مطلقہ یا بیوہ کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھے۔ اور جو ان مطلقہ یا بیوہ کی جوانی کا زمانہ اس غلط رسم کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ معاشرتی تحفظ اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ اگر ان خواتین کے بچے ہوں تو انہیں ان کی تعلیم و تربیت کے مسائل کا تن تنہا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں اس غلط معاشرتی رسم نے کئی خواتین کو دوسرے نکاح سے روک رکھا ہے۔

6۔ مردوں کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھنا

ہمارے معاشرے میں نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے نکاح ثانی کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ معیوب بات نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم میں واضح طور پر اس کی اجازت دی گئی ہے:

---

[1] ۔ http://www.pbs.gov.pk/content/population-15-years-and-above-marital-status , retrived: MAY 22, 2019

[2] - https://www.dawn.com/news/1388758
Ahmed Yusuf ,BEING SINGLE IN PAKISTAN, February 11, 2018, retrived: MAY 22, 2019

[3] ۔ البقرۃ 235:2

[4] ۔ ایضاً

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾[1]

"جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔"

آنحضور ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے بھی متعدد نکاح کیے جن کی تفصیلات مختلف کتب سِیَر و احادیث میں موجود ہے۔

اسلام مرد کو بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ عقد ثانی کی یہ اجازت کسی جواز، مجبوری یا ضرورت کے ساتھ مشروع نہیں ہے بلکہ صرف ازواج میں انصاف کے ساتھ مشروط ہے لیکن پاکستانی معاشرے میں عموماً عقد ثانی کسی انتہائی ضرورت مثلاً اولاد کا نہ ہونا، زوجین میں طلاق یا زوجہ کی وفات کی صورت میں ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن ان صورتوں میں بھی عموماً عقد ثانی کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے بلکہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے والے مردوں کو اکثر و بیشتر شدید قسم کے منفی سماجی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زوجین میں طلاق ہو جانے کی صورت میں بھی ایسے شخص کو اپنی بیٹی دیتے ہوئے دسیوں بار سوچا جاتا ہے۔ اور اگر زوجہ کی وفات ہو چکی ہو اور مرد صاحب اولاد ہو تو بچوں کی موجودگی ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری بھی اس مرد کے نکاح ثانی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ نتیجتاً بہت سے جوان مرد بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد ان معاشرتی رویوں کے باعث نکاح سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ سماجی رویہ ہندووانہ معاشرے کے ساتھ صدیوں میل جول رکھنے کی وجہ سے بھی ہمارے معاشرے میں در آیا جبکہ اگر سنت نبوی ﷺ کو سامنے رکھا جائے تو اس معاشرتی رویے کا کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بیک وقت متعدد نکاح کیے اور جس بات کی اجازت قرآن و سنت سے ثابت ہو اسے معیوب تصور کرنا درست نہیں۔

7۔ ذمہ داریوں سے انحراف

ایک طبقہ روشن خیال خواتین کا ہے جو عورت کی آزادی کی علمبردار ہیں۔ یہ خواتین تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ ہیں اور اپنے اخراجات میں کسی کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ نکاح کو اپنی آزادی کے خلاف سمجھتی ہیں۔ ان کو خاندان میں مرد کی سربراہی ماننا پڑے گی اور اس کی اجازت کے بغیر دیگر مصروفیات کے لیے باہر جانا مشکل ہو جائے گا۔ بچوں اور گھر کی مصروفیات بھی ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہوں گی۔ اس لیے وہ نکاح کے بغیر ہی مجرد زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا

---

[1]۔ النساء 3:4

مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾[1]

"مرد عورتوں کے نگہبان ہیں، اس کے سبب کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے مالوں میں سے خرچ کیا۔"

اسی طرح حدیث میں ہے:

"کلکم راع و مسئول عن رعیته فالامام راع و هو مسئول عن رعیته والرجل فی اهله راع و هو مسئول عن رعیته والمراة فی بیت زوجها راعیته و هی مسئولة عن رعیتها"[2]

" تم سب نگہبان ہو اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہو۔ سو حکمران نگہبان ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے اور مرد اپنے گھر کے بارے میں نگہبان ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔"

اسی طرح سیرت طیبہ میں ہمیں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی خاتون کی شادی نہ کی گئی ہو۔ سب صحابہ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں کیونکہ ہر ایک کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہیں اور دائرہ کار ہے۔ اس میں کسی کی آزادی سلب ہونے کی بات نہیں ہے۔ اس لیے یہ تصور کہ نکاح سے آزادی ختم ہو جاتی ہے لہٰذا نکاح نہیں کرنا چاہیے، بالکل غلط ہے۔ یہ امر کتاب اللہ اور سیرت طیبہ سے متصادم ہے۔

اسی طرح بعض مرد حضرات بھی نکاح سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ اس سے ان کی آزادی مجروح ہو گی۔ لہٰذا وہ ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے نکاح کے بغیر ہی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں جو کہ صریحاً غلط ہے۔

8۔ کثرت عبادت کی خواہش

ہمارے ہاں خواتین و حضرات میں کثرتِ عبادت کے باعث نکاح نہ کرنا بھی ایک سبب ہے اگرچہ اس کی شرح بہت کم ہے۔ سیرت طیبہ کی روشنی میں اس تصور کو دیکھا جائے تو یہ قابل رد ہے کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور اہل بیت میں سے کسی نے ازدواجی زندگی کو کثرتِ عبادت میں رکاوٹ نہیں سمجھا۔ یہ تمام ہستیاں کثرت کے ساتھ عبادت بھی کرتی تھیں اور اپنے گھریلو معاملات بھی بطریق احسن انجام دیتی تھیں۔ جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ کے گھر میں تین آدمی آپ کی عبادت کا حال

---

[1]۔ النساء4:34

[2]۔بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاستقراض،باب العبد راع فی مال سیده، رقم الحدیث: 2409

پوچھنے آئے۔ جب ان سے بیان کیا گیا تو انہوں نے اپنی عبادت بہت کم خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کی برابری کس طرح کرسکتے ہیں، آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ سب معاف ہو گئے ہیں۔ ایک نے کہا کہ مَیں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ مَیں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا کہ مَیں نکاح نہیں کروں گا اور عورت سے ہمیشہ الگ رہوں گا۔ اس کے بعد رسول ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! مَیں اللہ تعالیٰ سے تمہاری نسبت زیادہ ڈرنے والا اور خوف کھانے والا ہوں۔ اس کے باوجود مَیں روزہ رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور اس کے ساتھ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یادرکھو کہ: "فمن رغب عن سنتی فلیس منی"[1]

"جو میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میرے طریقے پر نہیں۔"

دین اسلام ویسے بھی ایک متوازن اور معتدل دین ہے۔ یہ رہبانیت کے خلاف ہے اس میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ اس کے تقاضے تبھی پورے ہوسکتے ہیں جب انسان عائلی زندگی کو اپناتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے دین کے مطابق زندگی کو گزارنا ہی اصل عبادت ہے۔

9۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول

پاکستانی معاشرے میں ایسا طبقہ بھی ہے جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے نکاح کو موخر کر دیتا ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں میں خواتین میں تعلیم کا تناسب حیرت انگیز طور پر بڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کی تعلیم تقریباً 47% ان کے نکاح میں تاخیر کا سبب بنتی ہے[2] کیونکہ عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین یا تو مجرد رہنا پسند کرتی ہیں یا پھر تاخیر سے نکاح کرتی ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں ایک کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد توقعات بڑھ جاتی ہیں اور آئیڈیل کا معیار بڑھ جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس دوران ان کی عمر اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ان کے لیے شادی مشکل ہو جاتی ہے۔

اصل میں یہ خرابی ہماری ترجیحات کی ہے کیونکہ ہم نے تعلیم کو صرف مادی ترقی اور فوائد کے حصول کا ذریعہ تصور کر لیا ہے۔ جبکہ اکثر خواتین میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا مقصد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معاشی لحاظ سے مستحکم جیون ساتھی کا پانا بھی ہوتا ہے۔ تمام صحابہ یا صحابیات کی سیرت کا جائزہ لیں تو ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ کسی نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے تجرد کی زندگی کو اختیار کیا ہو۔ آنحضور ﷺ جو خود معلم اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ بارگاہ خداوندی میں متعلم کی حیثیت بھی رکھتے تھے، ایک عظیم مشن ان کے سپرد تھا لیکن آپ ﷺ نے خانگی

---

[1] – ایضاً، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم الحدیث: 5063

[2] ۔ Hina Saleem,Late marriages and infertility :An Anthropological Analysis on Health, The Explorer Islamabad: Journal of Social Sciences,vol,1 issue (7): 246-250, retrived: May 22, 2019

زندگی سے منہ نہ موڑا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود خانگی زندگی کے تمام تقاضوں کو احسن طریقے سے نبھایا۔ تمام صحابہ کرامؓ علمی حوالے سے بلند مرتبے پر فائز ہیں، لیکن سب نے متعدد نکاح کیے اور عائلی زندگی سے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ حضرت عائشہؓ جو تمام خواتین میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں بلکہ جلیل القدر صحابہ بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے، کم سنی میں ہی رشتہ زوجیت میں بندھ گئی تھیں۔ نکاح ان کے حصول علم میں کبھی رکاوٹ نہ بنا بلکہ ان کے علم کو کمال ہی اپنے رفیق حیات سے ملا۔ اگر ہم اپنی ترجیحات کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کر لیں اور مادیت پرستی سے صَرف نظر کرتے ہوئے ایسے جیون ساتھی کا انتخاب کریں جو دیندار اور نیک خصائل کا مالک ہو، باہم احترام اور تعاون کرنے والا ہو تو شادی شدہ زندگی تعلیمی ترقی میں معاون بھی ہو سکتی ہے۔

10۔ مَردوں کا بے روزگار ہونا

بیروزگاری پاکستان کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ نوجوانوں میں بیروزگاری کی یہ شرح بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق بے روزگاری کی شرح 3.1% تھی[ii] جو 2017ء میں بڑھ کر 4.04 % تک پہنچ گئی۔[1] جبکہ 2019 میں یہ شرح 5.90% تک پہنچ چکی ہے۔[2] اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں صرف 39 فیصد نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حاصل ہیں۔[3]

بیروزگاری کی یہ بڑھتی ہوئی شرح نکاح میں بھی تاخیر کا سبب بن رہی ہے۔ نوجوان طبقے کا بیروزگار ہونا اور معاشی لحاظ سے والدین کا دست نگر ہونا نکاح میں ایک بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ ایک طرف تو بیروزگار لڑکے کو کوئی رشتہ نہیں دیتا اور دوسری طرف لڑکے کے والدین بھی لڑکے کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾[4]

"اور تم لوگ اپنے میں سے اکیلے (بغیر بیوی والے مردوں اور بغیر شوہر والی عورتوں) اور اپنے نیک

---

[1] - https://www.statista.com/statistics/383735/unemployment-rate-in-pakistan/, Pakistan: Unemployment rate from 2007 to 2017, retrived: MAY 22, 2019

[2] - https://tradingeconomics.com/pakistan/unemployment-rate , retrived: May 22, 2019

[3] - https://qaumiakhbar.com/2019/05/02/unemployment-factories/, retrived: May 22, 2019

[4] - النور 32:24

غلاموں اور باندیوں کے نکاح کر دیا کرو اگر وہ غریب ہیں تو (اس سے مت گھبراؤ) اللہ انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا۔"

پس غریب یا کم مال ہونے کے سبب سے شادی میں تاخیر کرنا بھی مناسب نہیں بلکہ اللہ پر توکل کے خِلاف ہے جو سراسر کمزوریٔ اِیمان کی علامت ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا ایک قول منقول ہے:

"عَجِبْتُ لِمَنِ ابْتَغَى الْغِنَى بِغَيْرِ النِّكَاحِ، وَاللهُ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِه-"[1]

میں اس کے بارے میں حیران ہوں جو نکاح کیے بغیر تونگری چاہتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ

﴿إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾

"اگر وہ غریب ہیں (تو اس سے مت گھبراؤ) اللہ انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا۔"

حدیث مبارکہ میں بھی نکاح کی صورت میں اللہ کی مدد کی یقین دہانی کرائی گئی ہے:

"ثَلاَثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللهِ عَوْنُهُمُ الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُكَاتَبُ الَّذِي يُرِيدُ الأَدَاءَ وَالنَّاكِحُ الَّذِي يُرِيدُ الْعَفَافَ-"

"تین لوگوں کی مدد کرنا اللہ پر اُن لوگوں کا حق ہے: اللہ کی راہ میں جِہاد کرنے والا، غلامی اور قرض وغیرہ سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرنے والا اور اپنی عِفت محفوظ رکھنے کے لیے نکاح کرنے والا۔"

پس یہ بات یقینی ہے کہ نیک نیتی سے، اپنی عِزت وعِفت محفوظ رکھنے کی نیت سے نکاح کرنے والے کی مدد اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے اور نکاح کرنے سے ایسے لوگوں کے رزق میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا۔

11۔ خواتین کی معاشی خود انحصاری

پاکستانی معاشرے میں مردوں کے مقابلے میں خواتین میں تعلیم کی شرح بڑھتی جارہی ہے جبکہ مردوں میں یہ شرح کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی وجہ سے مردوں کے مقابلے میں خواتین کی کثیر تعداد معاشی لحاظ سے مستحکم ہو رہی ہے۔ LFS کے مطابق 2001-2002ء میں بیروزگاری کی شرح 8.3% تھی جبکہ خواتین میں یہ

---

[1]-البغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود، امام (510ھ)، معالم التزیل فی تفسیر القران، المعروف بالتفسیر البغوی ،دار احیاء التراث العربی ، بیروت، 1410ھ، 3 :410

شرح % 16.5 تھی جو 2012-2013 میں کم ہو کر 9% پر آ گئی[1] اور یہ امر خواتین کے معاشی میدان میں خود انحصاری کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق:

> Out of estimated 180 million people, only 12.51 million Pakistani females of various ages are in employment of some sort. [2]

خواتین میں حصول تعلیم اور معاشی خود انحصاری کا یہ رجحان بتدریج بڑھ رہا ہے جبکہ تعلیمی قابلیت اور معاشی خود انحصاری کی صلاحیت مناسب رشتہ کی تلاش میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے کیونکہ لڑکی کے معیار کا پڑھا لکھا اور برسر روزگار لڑکا ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی مناسب رشتے کی تلاش میں عمر بیت جاتی ہے اور کبھی دلبرداشتہ ہو کر لڑکی مجرد رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ پھر معاشرے میں ایک عام تاثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب عورت معاشی لحاظ سے مستحکم ہے تو اب اسے مرد کے سہارے کی کیا ضرورت؟ ایسی صورتحال میں کچھ خواتین نکاح کو ایک بے مقصد اور فضول کام گردانتی ہیں جس کی انہیں ضرورت نہیں کیونکہ وہ معاشی لحاظ سے خود مختار ہیں اپنے ہر ضرورت خود پوری کر سکتی ہیں۔ اپنی آزادی کو قربان کر کے عائلی زندگی کی ذمہ داریاں انہیں غلامی کا طوق لگتی ہیں۔ اس لیے بھی کچھ خواتین نکاح اور عائلی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہیں اور مجردانہ زندگی کو اپنے لیے بہتر تصور کرتی ہیں۔

معاشی لحاظ سے پاکستانی معاشرے میں اگر بچیاں ملازمت وغیرہ اختیار کر کے معاشی خود مختاری حاصل کر لیں تو بھی مادیت غالب آ جاتی ہے اور بچیوں کے والدین خیال کرتے ہیں کہ یہ اب ہمارے اوپر بوجھ نہیں ہیں لہٰذا ان کی شادیوں میں تاخیر سے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا بلکہ بعض صورتوں میں وہ ان بچیوں سے معاشی معاونت حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

جب حضرت خدیجہؓ نے حضرت محمد ﷺ سے نکاح فرمایا تھا تو معاشی لحاظ سے آپ ﷺ سے کہیں زیادہ مستحکم تھیں لیکن آپ ﷺ کے عمدہ اخلاق کی بنا پر انہوں نے آپ کو نکاح کا پیام بھیجا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ جوڑا ایک بہترین جوڑا ثابت ہوا۔ ازدواجی زندگی کے پچیس سال بے مثل ذہنی ہم آہنگی، قلبی تعلق، محبت اور مودّت کی فراوانی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ عمر کا تفاوت اور معاشی فرق کہیں بھی کامیاب ازدواجی زندگی کی راہ میں

---

1 - https://www.pakistangendernews.org/womens-employment/
Shazia Mirza ,Women's employment, August 18, 2014, retrived: MAY 22, 2019

2- ibid

رکاوٹ نہ بنا اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

"اذا اتا کم من ترضون خلقه و دینه فزوجوه الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض وفساد عریض۔" [1]

"جب تمہارے پاس کوئی رشتہ آئے جس کا دین اور اخلاق تمہیں پسند ہو تو اس سے نکاح کر لو اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ وفساد پھیل جائے گا۔"

ہاں شریعت نے شادی بیاہ کے موقع پر آپس میں مماثلت، یگانگت، برابری اور کفو ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان فکر وخیال، معاشرت، طرز رہائش اور دینداری وغیرہ میں یکسانیت یا قربت ہونے کی صورت میں اس کی زیادہ امید ہوتی ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار گزرے اور رشتۂ نکاح مستحکم ہو۔ بے جوڑ نکاح عموماً ناکام رہتے ہیں اور اس ناکامی کے برے اثرات ان دونوں شخصوں سے متجاوز ہو کر دونوں کے گھروں اور خاندانوں تک پہنچتے ہیں، اس لیے احکام نکاح میں شریعت نے کفور کی رعایت کی ہے۔ لیکن صرف تعلیم یا معاشی برابری بہر حال کامیاب ازدواجی زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتے بلکہ عمدہ اخلاق، خوف خدا اور دینداری ہی وہ صفات ہیں جو ایک پائیدار اور کامیاب ازدواجی زندگی کی ضمانت ہو سکتی ہیں لہٰذا ہمیں اپنی ترجیحات کا رخ تبدیل کرنا ہو گا۔

12۔ ذات برادری اور مسلک کے اندر نکاح پر اصرار

ہمارے معاشرے میں ذات پات کی بہت پابندی کی جاتی ہے۔ ہندو معاشرے میں صدیوں اکٹھا رہنے کی بدولت یہ تصور مسلمانوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ذات یا پھر اپنے مسلک سے باہر شادی کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے لیے ذات برادری اور مسلک ہی کو ترجیح دینے کی وجہ سے عموماً یا تو نکاح میں تاخیر ہو جاتی ہے یا پھر بے جوڑ شادیاں کرنی پڑتی ہیں جو آگے چل کر مزید مسائل کا سبب بنتی ہیں۔ جبکہ اسلام میں ذات پات، حسب نسب کی بنا پر کوئی تفریق یا امتیاز نہیں پایا جاتا۔ تمام انسانوں کا نسب ایک ہی ہے کہ سب کے سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، یہی انسان کی حقیقت ہے۔ جیسا کہ متعدد احادیث میں یہی حقیقت واشگاف الفاظ میں بار بار بیان کی گئی ہے۔ "اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْا آدمَ وَ آدمُ مِنْ تُرَابٍ"[2] تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ جبکہ قوم برادریاں ذات پات تو سب پہچان کا ذریعہ

---

[1]۔ ابن ماجه، ابو عبدالله بن یزید القزوینی، السنن، ابواب النکاح، باب الاکفاء، رقم الحدیث :1948

[2]۔احمد بن حنبل، المسند، مسند ابی ہریرہ، رقم الحدیث: 8736

ہیں۔﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾[1] اور تمہارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ تمہیں آپس میں پہچان ہو۔

پاکستانی معاشرے میں عموماً نکاح کے لیے ذات پات کی پابندی سب سے زیادہ سادات میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جب ہم آپ ﷺ کے اسوہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے چار میں سے تین صاحبزادیوں کا نکاح غیر سید حضرات سے کیا۔ آپ ﷺ کی بڑی صاحب زادی زینبؓ کا نکاح ابو العاص سے ہوا جو بنو امیہ سے تھے۔ اور حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا نکاح یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ سے ہوا جو بنو امیہ سے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی چچازاد بہن ضباعہ بنت زبیر کا نکاح مقداد بن اسودؓ سے اور پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کا نکاح اپنے ہی آزاد کردہ غلام زید بن حارثؓ سے کر دیا۔ اس کے بعد انہی زید کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ کا نکاح قریش کی ایک عالی نسب خاتون فاطمہ بنت قیسؓ سے کر دیا۔ آپ ﷺ کی پیروی میں آپ کے صحابہ میں بھی یہی رجحان پھیلا اور حسب نسب سے ہٹ کر شادیاں ہونے لگیں۔ حضرت ابو حذیفہؓ نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہؓ کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سالمؓ سے کر دیا۔

حسب نسب کے غرور کو توڑنے میں آپ ﷺ کے اہل خاندان بھی پیچھے نہ رہے۔ حضرت علیؓ نے اپنی صاحبزادی ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمرؓ سے کیا جو کہ سید نہ تھے۔ حضرت حسینؓ کی بیٹی فاطمہؓ کا نکاح حضرت عثمان کے پوتے عبداللہ بن عمرؓ سے ہوا جو کہ سادات کے دائرے میں داخل نہ تھے۔ آپؓ کی دوسری صاحبزادی سکینہؓ کی شادی مصعب بن زبیر اور ان کی شہادت کے بعد عبداللہ بن عثمان بن عبداللہ بن حکیم بن حزام سے ہوئی۔ یہ دونوں حضرات بھی سید نہ تھے۔ حضرت امام حسنؓ کی متعدد پوتیوں کا نکاح غیر سید میں ہوا جن میں زینبؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ لیکہ اور ام قاسم شامل ہیں۔

آپ ﷺ نے نسلی تفاخر کو جاہلیت قرار دیا اور نسلی برتری کے احساس کو جرم۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے خطبات میں نسلی تفاخر اور جاہلیت کی مذمت کرتے ہوئے وحدت نسل انسانی پر زور دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> "یا ایها الناس، ان الله قد اذهب عنكم عبية الجاهلية وتعاظمها بابائها، فالناس رجلان: بر تقی كريم على الله، و فاجر شقی هين على الله، والناس بنو آدم وخلق الله آدم من تراب"[2]

---

[1] ۔ الحجرات 13:49

[2] ۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ،کتاب مسنون ادعیه و اذکار، باب قَوْلِ رَسُولِ اللَّهِﷺ رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ، رقم الحدیث: 3545

"لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء واجداد پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ انسان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نیک اور متقی جو اللہ کے ہاں معزز ہے۔ اور دوسرا فاجر اور بد بخت جو اللہ کے ہاں بے وزن ہے۔ انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نکاح کے لیے جس کے بھی اخلاق پسند آجائیں اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ کیونکہ ذات برادریوں کی تقسیم لایعنی اور بے مقصد ہے۔

13۔ والدین کی خدمت یا وفات کی صورت میں نکاح میں تاخیر

بسا اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ بوڑھے والدین کی خدمت اور دیکھ بھال بھی نکاح میں تاخیر کا سبب بن جاتی ہے۔ عموماً ایسی صورتحال خواتین کے ساتھ پیش آتی ہے۔ جب اولاد نرینہ نہ ہو اور والدین ضعیف لاغر اور بیمار ہوں یا پھر بیٹے اپنی اپنی گھر گرہستی میں مصروف ہو جائیں اور والدین کی خدمت اور دیکھ بھال یا بہن کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کی طرف سے غفلت کا مظاہرہ کریں تو ایسی صورتحال بھی نکاح میں تاخیر کا سبب بنتی ہے۔ والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کی وفات کی صورت چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش اور کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ عموماً بڑے بچوں پر آجاتا ہے، بہن بھائیوں کی پرورش اور ان کے معاشی استحکام اور شادی بیاہ کے چکروں میں ان کے نکاح میں عموماً تاخیر ہو جاتی ہے۔

اسلام میں والدین کی خدمت کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ والدین کی خدمت کو مغفرت اور جنت کے حصول کا موجب بتایا ہے۔ فرمایا: "اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو بھی بڑھاپے میں پایا اور ان کی خدمت کر کے اپنی مغفرت نہ کرالی۔"[1]

لیکن والدین کی خدمت یا چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کے لیے نکاح میں تاخیر درست نہیں۔ بلکہ ایسی صورت میں ایسے جیون ساتھی کا انتخاب کرنا چاہیے جو ان حالات میں معاون اور مددگار ثابت ہو جیسا کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ ہے کہ جب انہوں نے ایک ثیبہ (شوہر دیدہ عورت) سے نکاح کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ باکرہ (کنواری) لڑکی سے کیوں نہ کیا کہ تم اس سے کھیلتے اور وہ تم سے کھیلتی۔ اس پر حضرت جابرؓ نے وجہ بیان کی کہ میری کئی چھوٹی بہنیں ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ ایسی عورت سے نکاح کروں جو ان کی دیکھ بھال کرے۔ لہٰذا ذمہ داریوں کی بنا پر نکاح میں تاخیر کرنا روا نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے اگر ایسے جیون ساتھی کا انتخاب کیا جائے جو نیک، دیندار، عمدہ اخلاق کا مالک اور خوف خدا رکھنے والا ہو تو ایسا جیون ساتھی ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے

---

[1] - بیہقی، احمد بن الحسین، شعب الایمان، باب حقوق الاولاد والأهلين، مكتبة الرشد للنشر والتوريخ بالرياض، رقم الحديث:8299

لیے بہترین رفیق اور معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

14۔ شادی کے منفی رسوم ورواج

پاکستان میں بہت سے منفی رسوم ورواج بھی نکاح کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک منگنی کی رسم ہے۔ منگنی اور شادی کے درمیان کا طویل دورانیہ کسی بھی طرح درست نہیں کیونکہ اس طرح ایک تو لڑکی لڑکا ایک دوسرے کے پابند ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے کہیں اور شادی کی بات نہیں چلائی جاسکتی۔ دوسرا شادی کے انتظار میں ان کی عمر نکل جاتی ہے، اور کبھی کبھار لمبے انتظار کے بعد منگنی ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ اب عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بھی کہیں اور شادی کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر ہمارے ہاں عموماً اگر گھر میں غیر شادی شدہ بہنیں موجود ہوں تو لڑکے کی شادی میں تاخیر کی جاتی ہے جب تک کہ تمام بہنیں اپنے گھروں کی نہ ہو جائیں۔ اس صورت میں بھی لڑکے کی نکاح کی عمر نکل جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں بڑی لڑکی کے ہوتے ہوئے چھوٹی کی شادی کو انتہائی غیر مناسب سمجھا جاتا ہے۔ عموماً بڑی لڑکی کے لیے مناسب رشتہ کی تلاش میں چھوٹی کی نکاح کی عمر بھی نکل جاتی ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دو ہجری میں جب حضرت فاطمہؓ کے لیے حضرت علیؓ کا رشتہ آیا تو اس وقت حضرت ام کلثومؓ جو کہ حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں لیکن آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ان کے عمدہ اخلاق کی بدولت اپنی جگر گوشہ کے لیے بلا تامل پسند فرمایا اور ان دونوں کا نکاح کروا دیا جبکہ حضرت ام کلثومؓ کا نکاح بعد میں تین ہجری میں حضرت عثمانؓ سے ہوا۔ جب لڑکا یا لڑکی بالغ ہو جائیں، نکاح کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل ہو جائیں تو ان کے نکاح میں ان فضول رسومات کی بنا پر تاخیر روا نہیں ہے، بالغ ہونے پر نکاح اولاد کے بنیادی حقوق اور والدین کے فرائض میں شامل ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

جس کے ہاں لڑکا پیدا ہو، تو وہ اس کا اچھا نام رکھے، اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کرے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے۔ اگر بالغ ہو گیا اور اس کی شادی نہیں کی اور وہ کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا تو اس کا گناہ اس کے والد پر ہو گا۔

15۔ طبی و حیاتیاتی مسائل

پاکستانی معاشرے میں نکاح کے حوالے سے ہماری ترجیحات پر مادیت پرستی کا غلبہ ہے۔ جس کی وجہ سے ایک عام انسان کے لیے بھی مناسب رشتہ کی تلاش کسی مہم سے کم نہیں ہوتی تو ان حالات میں کسی بھی قسم کی جسمانی معذوری کے ہوتے ہوئے رشتہ کا ملنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ ہاں بعض اوقات کچھ اس قسم کے طبی اور حیاتیاتی مسائل اور پیچیدگیاں بھی ہوتی ہیں جن کی بنا پر افراد ازدواجی زندگی اور نسل انسانی کی افزائش و بقا کا سلسلہ جاری رکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال بھی نکاح کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اگر نکاح کے بعد ایسی

صورت حال سامنے آتی ہے تو اسلام نے مرد کو دوسری شادی یا طلاق اور عورت کو خلع کا حق بھی دیا ہے۔

نتائج بحث

نکاح نہ صرف سنت نبوی ہے بلکہ ایک صالح معاشرے کے قیام اور تحفظ اخلاق، عفت و عصمت کے لیے بھی لازم ہے۔ جس معاشرے میں نکاح دشوار ہو وہاں اخلاقی بے راہ روی اور زنا عام ہو جاتا ہے۔ قوموں کے اخلاق پست ہو جائیں تو قومیں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن و سنت میں نکاح پر زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ نکاح میں تاخیر افراد کے اخلاق میں زوال کا سبب بنتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ مادیت پرستی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ مادیت پرستی کا یہ غلبہ نکاح میں تاخیر کا سبب بنتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول صرف اور صرف مادی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے اور ان مادی فوائد کے حصول تک عموماً نکاح کی عمر نکل جاتی ہے۔ پھر ہمارے ہاں رشتہ دیکھتے ہوئے معمولی سے معمولی نقص کو بھی عیب شمار کرتے ہوئے رشتہ رد کر دیا جاتا ہے۔ کسی کا قد چھوٹا ہو یا رنگ سانولا ہو، ناک موٹی ہو تو رشتہ سے انکار کے لیے یہی بہت بڑے جواز ثابت ہوتے ہیں۔ ہر شخص پرفیکشن (Perfection) چاہتا ہے جبکہ پرفیکشن تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہی ہے اور نہ تو کوئی بھی انسان کامل خوبیوں کا مجسمہ نہیں ہوتا۔ بہت ساری سلیقہ مند، نیک سیرت اور اچھی فکر کی حامل لڑکیاں بھی صرف اپنے دبتے رنگ کی وجہ سے گھروں میں کنواری بیٹھی رہ جاتی ہیں اور بہت سارے مردوں کے لیے صرف داڑھی رکھنا ہی جرم ثابت ہوتا ہے۔ قصور ہماری ترجیحات کا ہے جن کی بدولت نکاح مشکل سے مشکل ہوتا جارہا ہے اور معاشرہ کئی قسم کی اخلاقی بیماریوں کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ جب نکاح کے ذریعے اخلاق کا تحفظ نہ کیا جائے اور دوسری طرف انٹرنیٹ اور میڈیا دعوت گناہ دے رہے ہوں تو ایسے معاشرے میں جرائم کے لیے جتنی بھی بڑی سزائیں مقرر کر لی جائیں جرائم روکے نہیں جاسکتے۔ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرے کے قیام کے لیے درست لائحہ عمل صرف اور صرف قرآن و سنت سے ہی مل سکتا ہے۔ نکاح کی اسی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے آغاز اسلام سے ہی معاشرے کے بے نکاح افراد کا نکاح تمام حکومتوں کی ترجیحات میں شامل رہا ہے۔ آپ ﷺ خود ایسے افراد کے نکاح کا انتظام فرما دیا کرتے تھے۔ خلفاء راشدین نے بھی اس سنت پر عمل جاری رکھا اور محاصل کو جہاں علاقے کی فلاح اور ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا وہیں اس سے معاشرے کے نادار افراد کے نکاح کا بھی خصوصی طور پر انتظام کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عثمانی خلافت میں عائلی قوانین اور خاص کر شادی کا قانون بہت زبردست تھا مثلاً نکاح کی عمر 18 سے 25 سال مقرر تھی۔ پچیس سال کی عمر تک شادی نہ کرنے والے کو سرکاری ملازمت کے لیے نااہل قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کی آمدن کا پچیس فیصد لے کر نکاح کے خواہش مند حضرات کے نکاح کے لیے خرچ کیا جاتا۔ بیماری کی صورت میں میڈیکل چیک اپ کیا جاتا قابل علاج بیماری کا علاج اور ناقابل علاج بیماری کی صورت میں عذر قبول کیا

جاتا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروفیت کے سبب شادی میں تاخیر کی درخواست قبول کی جاتی۔ بیروزگار افراد کو مفت زمین اور کاروبار کے لیے قرضہ دیا جاتا۔ والدین کی خدمت کے لیے عسکری خدمات سے استثناء کے علاوہ بچوں کے لیے مختلف وظائف کا اہتمام بھی تھا۔

تجاویز وسفارشات

ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں جن پر عمل کر کے ان عوامل کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے جو نکاح کی راہ میں تاخیر یا رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں:

- نکاح کو آسان اور سادہ بنانے کے لیے منفی سماجی رسومات اور شادی بیاہ پر بے دریغ پیسے کا استعمال اور نمود و نمائش کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ لمبی چوڑی باراتوں اور جہیز کی لعنت کو ختم کر کے سنت نبوی ﷺ کے مطابق سادہ ولیمہ کی رسم کو قائم رکھا جائے۔
- مطلقہ اور بیوہ کے نکاح ثانی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- بامقصد تعلیم دی جائے جو معاشرے کو صالح افراد تیار کر کے دے اور عملی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ افراد کوئی ہنر سیکھ کر باعزت روزگار شروع کر سکیں۔
- ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو نوجوانوں کو نہ صرف آسان قرضے دیں بلکہ ان کی دلچسپی کے کاروبار شروع کرنے اور جمانے میں مشاورت اور معاونت بھی کریں۔
- والد یا والدین کی وفات کی صورت بچوں کی کفالت، تعلیم، کاروبار اور شادی میں مکمل معاونت کی جائے۔
- جو افراد والدین کی خدمت کے سبب نکاح نہ کر رہے ہوں ان کو گھر کے نزدیک ملازمت یا کاروبار کی سہولت اور وظائف دیئے جائیں۔
- طبی اور حیاتیاتی مسائل کے شکار افراد کا علاج ممکن ہو تو ان کو علاج معالجے کی مفت سہولت دی جائے اور ان کے نکاح کا بندوبست کیا جائے۔
- مادیت پرستی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ نکاح کے حوالے سے ترجیحات کی تبدیلی اور تعلیمات نبوی کو عام کرنے کے لیے الیکٹرونک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کا استعمال کیا جائے۔ تاکہ معاشرتی رویوں میں تبدیلی لائی جاسکے۔
- حکومت اور مخیر حضرات کے تعاون سے ایسے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں جو نادار، غریب اور نکاح کے خواہشمند خواتین وحضرات کے نکاح میں معاونت کریں۔
- معاشرے کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی لانے کے لیے نہ صرف سیمینارز اور کانفرنسز کا انعقاد کیا

جائے بلکہ مساجد، مدارس اور گلی محلوں میں آگاہی مہم کا آغاز کیا جائے جن کے ذریعے نہ صرف تعلیمات نبوی ﷺ کا عام کیا جائے بلکہ اس کے ذریعے رائے عامہ میں تبدیلی لائی جائے۔ لوگوں میں شعور و آگہی پیدا کی جائے اور منفی رویوں، سوچ اور ترجیحات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

- حکومتی سطح پر ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے نکاح کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ اور ایسے قوانین بھی بنائے جائیں جن سے ایک طرف نکاح کو سادہ اور آسان بنانا ممکن ہو اور دوسری طرف نوجوانوں کو روزگار مہیا کرتے ہوئے ایک مقررہ عمر تک نکاح کے لیے مجبور کیا جائے۔ پہلے سے موجود قوانین پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔

[i] - https://www.geo.tv/latest/226958-the-big-business-of-weddings-in-pakistan
The big business of weddings in Pakistan, retrived: MAY 22, 2019

[ii] -http://www.pbs.gov.pk/sites/default/files//tables/UN-EMPLOYMENT%20RATES.pdf, retrived: MAY 22, 2019

اولڈ ایج ہومز اور والدین کی کفالت کا تصور

تعلیمات نبوی ﷺ کے تناظر میں

ڈاکٹر نسیم محمود*

اقراء خالد**

ABSTRACT

Islam is a perfect religion and provides solution to all problems. Establishment of old age homes for unattended elders is a contemporary issue. Parents are the backbone part of the family system and they are the major source of the child birth and his/her training for the daily life routine matters. The part which feeds and uplifts the children may also be cared when they are in need of the care.

This research paper is a discussion about the introduction, need, social role and justification of the old age homes. Islam imposes some family social and ethical obligations on the children with respect to the parents in their old lives when they feel the need of some caring persons. Some prohibited and permissible aspects of the old ages have been mentioned in this research paper which will provide the guideline for the positive use of the old age homes as well as the children responsibilities towards the parents in Islamic perspective.

اسلام دینِ فطرت ہے اور معاشرے کے ہر فرد کو نہ صرف رہنمائی اور ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے بلکہ اس کی دنیوی زندگی کو پر سکون بنانے کے لیے بھی اس کو اصول وضوابط فراہم کرتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں سہولیات کی

* اسسٹنٹ پروفیسر، ادارہ عربی وعلومِ اسلامیہ، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی یونیورسٹی، سیالکوٹ

** جزوقتی لیکچرار، ادارہ عربی وعلومِ اسلامیہ، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی یونیورسٹی، سیالکوٹ

فراہمی حوالے سے ایک معاملہ مستحقین خصوصاً بزرگ افراد کی کفالت کا بھی ہے جو عصر حاضر کے معاشرتی حالات میں اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس مقالے میں کفالت، اولاد کی ذمہ داری، والدین کے حقوق اور اولڈ ایج ہومز کے متعلق امور کا تعلیمات نبوی کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا۔

کفالت کا لغوی معنی

عربی زبان میں ثلاثی مجرد کے باب سے مشتق اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی کی 'المفردات فی غریب القرآن' کی تصریحات کی روشنی میں: "الکفالة: ضمانت کو کہتے ہیں اور تکفلت بکذا کے معنی کسی چیز کا ضامن بننے کے ہیں۔ کفلتة فلانا کے معنی ہیں میں نے اسے فلاں کی کفالت میں دے دیا"[1] قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾[2]

"اور زکریا کو اس کا متکفل بنایا۔"

تاج العروس میں امام زجاج کے حوالے سے کفالت کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے:

قال الله تعالیٰ: فقال اکفلنیها و عزنی فی الخطاب "الزجاج معناه اجعلنی انا اکفلها و انت تنزل عنها [3]

"قرآن حکیم میں ہے: اس نے کہا اسے میری کفالت میں دے دو اور اس نے بات چیت میں مجھ پر غلبہ پالیا۔"

زجاج کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں اس کی کفالت کروں گا تُو اس سے دستبردار ہو جا۔"

کفالت کا مفہوم

اردو میں کفالت کے معنی ہیں اپنے ذمّے کوئی بار یا کام لینا، ذمہ داری، وکالت، کفیل ہونا، نان نفقہ، خرچ وغیرہ کا یا کسی کا نگران ہونا۔ ریاست میں کفالت عامہ کا مطلب ہے اسلامی ریاست کا تمام افراد کی بنیادی ضروریات

---

[1] -راغب اصفہانی، ابو القاسم، المفردات فی غریب القرآن، مطبعه مصطفیٰ البابی و اوده، مصر، 1961ء، 409

[2] - آل عمران 3: 37

[3] -زبیدی ، محمد مرتضیٰ، تاج العروس، باب الام، فصل الکاف، منشورات دار مکتبه الحیاة ، بیروت لبنان، 1414ھ، 135/30

زندگی کی فراہمی کا اہتمام کرنا۔ بنیادی ضروریات میں خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، علاج اور انصاف خصوصی طور پر شامل ہیں۔ کفالت عامہ کی اہمیت قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ اسلامی ریاست میں مخیر حضرات کو کفالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور جن پر نگران مقرر کیا گیا ہے ان کی نگرانی سے روگردانی کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

"من ولاه الله شيئا من امر المسلمين فاحتجب دون حاجتهم و خلتهم و فقرهم احتجب الله عنه دون حاجته و حلته و فقره." [1]

"جسے اللہ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پرواہ ہو کر بیٹھا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔"

ایک اور ارشاد اس طرح سے ہے:

"ما من عبد يسترعيه الله رعية فلم يحطها بنصيحة الا لم يجد رائحة الجنة" [2]

"جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔"

گویا کفیل یا نگران کے لیے اپنے ذمہ امور کو سرانجام دینا ضروری ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرے گا تو جنت سے دور ہو جائے گا کیونکہ جو شخص جنت کی خوشبو نہیں پا سکے گا اس کے لیے اس کا حصول کیسے ممکن ہے۔ کفالت عامہ کے فریضہ کی ادائیگی کے عملی نمونے ہمیں نبی کریم ﷺ کے علاوہ صحابہ کرام اور اور ملت اسلامیہ کے دیگر حکمرانوں کی زندگی سے ملتے ہیں جن میں خاص طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ قابل ذکر ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کفالت کے تصور کو اپنے دورِ خلافت میں بہت عام کیا، غربا و مساکین کی کفالت کے لیے بیت المال کے نظام کو از سرِ نو ترتیب دیا، وفاقی دار الحکومت مدینہ

---

[1] ۔ابوداؤد، السنن، سلمان بن اشعث ،کتاب الخراج و الامارة و الفی، باب فیما یلزم الامام من الامر الرعیة و الحجبة عنه، دار الحدیث ، قاہرہ، رقم الحدیث: 2948

[2] ۔ بخاری، الجامع الصحیح، محمد بن اسماعیل، کتاب الاحکام، باب من اشرعی رعیة فلم ینصح، دالقلم، دمشق، بیروت، رقم الحدیث: 6731

منورہ کے علاوہ دیگر صوبوں میں بیت المال کی عمارتیں تعمیر کرائیں، بیت المال کی آمدن و خرچ کا باقاعدہ حساب و کتاب مرتب کیا، نظم وضبط کے لیے انتہائی محنتی اور اچھے کردار و شہرت کے حامل افراد کو منتظم بنایا۔ حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے بیت المال کے افسر تھے، جب کہ کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود اور خالد بن حرث رضی اللہ عنہما کو بطورِ افسر مقرر کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المال میں آنے والی رقم کو انتہائی احتیاط کے ساتھ خرچ کرتے ہوئے حقیقی مستحقین تک پہنچایا۔

کفالت کی اقسام

کفالت کی دو قسمیں ہیں: اجتماعی کفالت اور انفرادی کفالت

1۔ اجتماعی کفالت

اسلام نے اجتماعی کفالت کو ایک نظام کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ اجتماعی کفالت میں مختلف طبقاتِ معاشرہ کی کفالت شامل ہے جیسے اگر سورہ البلد کی آیات کے مطابق معاشی کفالت کی ہی بات کی جائے تو اسلامی نظام معیشت کے مطابق معاشرے میں کوئی بھی طبقہ ایسا باقی نہیں رہنا چاہیے جسے معاشی کفالت کی ضرورت ہو اور وہ معاشی کفالت نہ پا سکے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ. فَكُّ رَقَبَةٍ۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾[1]

"وہ تو (دینِ حق اور عمل خیر) کی دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور آپ کیا سمجھے کہ وہ (دین حق کے مجاہدہ کی) گھاٹی کیا ہے؟ وہ (غلامی و محکومی کی زندگی سے) کسی گردن کا آزاد کرانا ہے۔ یا بھوک والے دن (یعنی قحط و افلاس کے دور میں غریبوں اور محروم المعیشت لوگوں کو) کھانا کھلانا ہے۔ (یعنی ان کے معاشی تعطل اور ابتلاء کو ختم کرنے کی جدوجہد کرنا ہے)۔ قرابت دار یتیم کو یا شدید غربت کے مارے ہوئے محتاج کو جو محض خاک نشین مسکین (اور بے گھر) ہے۔"

اسلامی تاریخ میں دیکھیں تو اجتماعی کفالت کی عملی تفسیر ہمیں مواخات مدینہ کی صورت میں ملتی ہے۔ چونکہ

---

[1]۔ البلد 90: 11-16

ریاستِ مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی حکومت کے پاس اس قدر وسائل موجود نہ تھے کہ وہ ہجرت کر کے آنے والوں کی آباد کاری اور دیگر ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس لیے آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان رشتہ مواخات قائم کر کے نہ صرف اس بات کا انتظام کیا بلکہ اجتماعی کفالت کے تصور کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ انصارِ مدینہ نے اپنی جائیدادوں اور اثاثوں سے قدرتی محبت ہونے کے باوجود انہیں مہاجرین کی کفالت کے لیے پیش کر دیا۔ اس طرح مہاجرین کی خوراک، رہائش اور آباد کاری کا یوں ہنگامی طور پر انتظام فرما کر اجتماعی کفالت عامہ کی ایسی مثال قائم کر دی جس سے مسلمان رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کفالت اور نگرانی کے احساس ذمہ داری کی بدولت ہی خلفائے راشدین نے اپنے اور عوام کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہ کی کہ رعایا کو اپنے کسی حق کی طلب میں رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے کیونکہ ان کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان تھا:

"الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته، فالامام الذی علی الناس راع و هو مسئول عن رعیته." [1]

"آگاہ رہو تم میں سے ہر ایک آدمی نگران ہے اور (روز قیامت) اس سے اس کی رعیت (ماتحت لوگوں) کے بارے میں باز پرس کی جائے گی تو (اس طرح) لوگوں پر امیر یا حکمران بھی ایک نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

اسلامی شریعت میں امارت کے منصب پر فائز شخص اپنی رعایا کی کفالت سے کسی صورت بھی بری الذمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ محروم و مجبور افراد کی کفالت کا اہتمام کرے اور اس کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسا نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا ہے:

"مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لایجہد لهم و ینصح الا لم یدخل معهم الجنة." [2]

"جو آدمی مسلمانوں کے معاملے (حکومت) کا نگران بنے پھر ان کی بہتری کے لیے کوشش نہ کرے اور نہ ہی ان کی خیر خواہی کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو گا۔"

---

[1] ۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الحکام، باب قول الله تعالیٰ اطیعوا۔۔۔ الامر منکم، رقم الحدیث: 7138

[2] ۔ مسلم، الجامع الصحیح، مسلم بن حجاج،کتاب الایمان، باب استحقاق الوالی الغاش الرعیة النار، دار احیاء التراث العربی، بیروت،رقم الحدیث: 142

یعنی اگر کوئی شخص کسی فرد یا افراد کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اور پھر اس کو پورا نہیں کرتا (اس ذمہ داری میں بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی شامل ہے) تو اس کوتاہی کی وجہ سے وہ جنت سے محروم ہو جائے گا۔ امام ابن حزم اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:

"ہر ملک کے مال دار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی ان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان امراء کو مجبور کرے گا کہ وہ ان اہل حاجت کے لیے اتنے مال کا انتظام کریں جس سے وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں، جاڑے اور گرمی کا لباس حاصل کر سکیں اور ان کے پاس ایسا مکان ہو جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔"[1]

مزید برآں اسلامی ریاست پر صرف مسلمان شہریوں کی کفالت کی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ غیر مسلم رعایا بھی اس میں شامل ہے۔ اس بارے میں ہمیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل سے رہنمائی ملتی ہے۔

2۔ انفرادی کفالت

انفرادی سطح پر معاشرہ میں مستحق افراد کی بہبود کے لیے ان کی کفالت کے تصور کو قرآن اور احادیث نبویہ میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾[2]

"اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔"

جہاں لوگ ضرورت مندوں پر خرچ نہ کریں ان کی ضروریات کا خیال نہ رکھیں، دوسروں کے معاملہ میں لاپرواہی کا مظاہرہ کریں تو یہ عمل بھی اللہ کو ناپسند ہے۔ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ:

---

[1]۔ ابن حزم، علی بن احمد، المحلی، مصر، ادرہ المنیریة، 1352، 6/156

[2]۔البقرة 2: 267

"ایما أهل عرصة اصبح فيهم امرؤ جائعًا فقد برئت منهم ذمة الله تعالى" [1]

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے اللہ کی حفاظت اور نگرانی کا وعدہ ختم ہو جاتا ہے۔"

اسلام نے تمام انسانوں کو باہمی ہمدردی اور خدمت گزاری کا درس دیا ہے۔ امیروں کو غریبوں کی امداد کرنے کی تاکید و تلقین فرمائی، مظلوموں اور حاجت مندوں کی فریاد رسی کی تاکید فرمائی، مسکینوں، یتیموں اور لاوارثوں و بے سہارا افراد کی کفالت اور نگرانی کا حکم دیا ہے۔ اسلام میں وہ شخص بہترین ہے جس کا وجود دوسروں کے لیے فائدہ مند ہو اور وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ مخلوق خدا کی خدمت کرنا، ان کے مصائب کو دور کرنا، ان کے دکھ درد کو بانٹنا اور ان کے ساتھ ہمدردی، غم خواری اور شفقت کا رویہ اختیار کرنا اسی کا ایک حصہ ہے۔ والدین کی کفالت کا تعلق بھی انفرادی کفالت سے ہے۔

والدین کی کفالت

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور دین فطرت ہے یعنی اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن ہیں۔ اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کا ایک مظہر والدین کا وجود ہے۔ والدین انسان کے اس دنیا میں آنے کا ذریعہ ہیں۔ بچپن میں انھوں نے ہی اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی ہے۔ عورت اور مرد کا سب سے خوبصورت روپ ماں باپ کا ہے۔ یہ روپ خالق کائنات کی رحمت اور حسن انتظام کا عکاس ہے۔ معاشرتی زندگی میں ایثار کو بہت اہمیت حاصل ہے اور کوئی بھی معاشرہ اس کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتا۔ ایثار و خلوص اور محبت و شفقت کی عملی تصویر ماں باپ ہیں۔ والدین کی عظمت اور ان کی حیثیت ہر دور مسلم و غیر مسلم معاشروں میں مانی جاتی رہی ہے۔ جیسے بنی اسرائیل سے لیے جانے والے عہد کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان ہوا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

---

[1] ۔ حاکم، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، رقم الحدیث:7307

وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ [1]

"اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا۔"

دنیا کے تمام بڑے مذاہب نے والدین کی عزت و تکریم اور ان کی خدمت و فرمانبرداری کی تلقین کی اور ترغیب دی ہے۔ ہر مذہب میں والدین کے رتبے اور مقام کا ذکر موجود ہے۔ توریت میں والدین کی تعظیم کے بارے میں یہ ہدایت موجود ہے کہ تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند نے تجھے دیتا ہے، دراز ہو۔ [2]

انجیل مقدس میں بھی اسی موضوع پر ہدایت ان الفاظ میں موجود ہے کہ:

"اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے۔
اسی ضمن میں عہد نامہ قدیم میں ہے: "جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں کو مارے وہ قطعی جان سے مارا جائے گا۔ [3]

والدین کی نافرمانی کو بائبل ایک جرم قرار دیتی ہے اور اس پر سزا تجویز کرتی ہے۔ کتاب اخبار میں یہ الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں:

"جو کوئی اپنے ماں باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا۔ جس نے اپنے ماں باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی اس کا خون اسی کے سر پر ہے۔" [4]

انسانی زندگی کے دیگر معاملات کی طرح والدین کے احترام و حقوق کے بارے میں اسلام میں بھی ہمہ گیر احکام موجود ہیں۔ اللہ نے اپنی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور اولاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ کوئی ایسی بات یا ایسا فعل نہ کرے جو ان کے احترام اور حسن سلوک کے منافی ہو۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان سے منہ نہ موڑے اور ان کے ساتھ نرمی کا رویہ

---

[1] ۔ البقرة 2: 83
[2] ۔ کتاب خروج، 20:12؛ استثناء، 5:16
[3] ۔ بائبل، عہد نامہ قدیم، کتاب خروج، 15:21
[4] ۔ بائبل عہد نامہ قدیم، کتاب اخبار، 9:20

اختیار کرے۔ نہایت ادب و احترام سے ان کے آگے اپنے کندھے جھکائے رکھے، ان کا کہا مانے، ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی نہ کرے، بڑھاپے، کمزوری یا بیماری کی صورت میں ان سے تنگ دل نہ ہو اور نہ ہی ان کی جانب سے کوئی بوجھ محسوس کرے۔ کیونکہ بعض لوگ بوڑھے والدین کی خدمت کرنے کی بجائے انہیں بوجھ سمجھتے ہیں اور انہیں اولڈ ایج ہومز میں چھوڑ آتے ہیں۔

اولڈ ایج ہومز کا تعارف

اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کو ایسے رشتہ میں باندھا ہے جس میں محبت ہی محبت ہے۔ دیگر تمام انسانی رشتوں سے بڑھ کر اس میں اپنائیت رکھی ہے۔ مگر وقت گزرنے کا ساتھ ساتھ اقدار بدلتی جا رہی ہیں۔ اب اولاد اپنے ماں باپ کو اپنے ساتھ رکھنا تو درکنار انہیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے اندر والدین کو اولڈ ایج ہومز میں رکھنے کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اولڈ ایج ہومز کا تصور مغرب کا ایجاد کرتا ہے مگر اب یہ پاکستان میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔ جس کی جہ سے گھر ویران اور اولڈ ایج ہومز آباد ہو رہے ہیں۔

اولڈ ہوم سے مراد بوڑھے، عمر رسیدہ افراد کی آرام گاہ ہے۔ وہ بوڑھے افراد جن کو ان کو بچوں نے گھر سے نکال دیا ہو، بے سہارا افراد اور لاوارث والدین کے رہنے کی جگہ جہاں ان کی روزمرہ ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں ان کے لیے خصوصی طبی سہولیات موجود ہوتی ہیں۔ یہاں رہنے والے افراد کو کمرے یا اپارٹمنٹ دیے جاتے ہیں جہاں کھانے پینے، اکٹھے مل بیٹھ کر گپ شپ کرنے، صحت اور تفریحی سرگرمیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کیمبرج ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> "A place where old people can live together and can be cared for when they are too weak or ill to take care of themselves"[1]
>
> "ایک ایسی جگہ جہاں بوڑھے لوگ اکٹھے رہ سکتے ہوں اور جب وہ بہت کمزور یا اس حد تک بیمار ہو جائیں کہ اپنا خیال بھی نہ رکھ سکیں تو وہاں ان کی نگہداشت کی جاتی ہو۔"

ان کے لیے کیئر ہوم (Care Home) یا شیلٹر ہوم (Shelter Home) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

---

1. Cmbridge University Press, Retrived From dictionary.cambridge.org

اولڈ ایج ہومز کے قیام کا اصل مقصد

اولڈ ایج ہومز کے قیام کا سبب لاوارث اور بے سہارا افراد کو سہارا فراہم کرنا تھا۔ ایسے افراد جن کا دنیا میں کوئی نہ ہو اور نہ ان کے پاس ایسے وسائل موجود ہوں جن سے وہ اپنے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام کر سکیں۔ ایسے مجبور افراد کی ضروریات زندگی کا سامان کرنے کا تصور ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے بھی ملتا ہے۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام "کتاب الاموال" میں بیان کرتے ہیں کہ:

"ان امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ مرَّ بشیخ من اھل الذمة، یسئال علی ابواب الناس ۔ فقال: ما انصفناک ان کنا اخذنا منک الجذیة فی شبیبک، ثم ضیعناک فی کبرک۔ قال: ثم اجری علیه من بیت المال ما یصلحه" [1]

"امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ غیر مسلم شہریوں میں سے ایک بوڑھے شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کے دروازے پر بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: "ہم نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ ہم نے تمہاری جوانی میں تم سے جذیہ وصول کیا، پھر تمہارے بڑھاپے میں تمہیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس کی ضروریات کے لیے بیت المال سے وظیفہ کی ادائیگی کا حکم جاری فرمایا۔"

بے سہارا اور لاوارث بوڑھے افراد کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے وسائل بہم پہچانے کی جدید صورت اولڈ ایج ہومز ہیں۔ اس طرح ان متاثرہ افراد کے لیے یہ ہومز ایک نعمت ہیں اور مجبور افراد کے لیے ان کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسے مخیر حضرات جنھوں نے اولڈ ایج ہومز بنائے اور وہاں لاوارث، بوڑھے، کمزور محتاج، اولاد کے ٹھکرائے ہوئے اور اپنوں کے ستائے ہوئے لوگوں کو سہارا دینے کا انتظام کیا، یہ ان کے لیے دنیا اور آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہیں۔

اولاد کی تعلیم و تربیت میں والدین کا کردار

لفظِ "تربیت" ایک وسیع مفہوم رکھنے والا لفظ ہے، آسان الفاظ میں اس کی تعریف یوں کی جائے گی کہ برے اخلاق و عادات اور غلط ماحول کو اچھے اخلاق و عادات اور ایک صالح، پاکیزہ ماحول سے تبدیل کرنے کا نام "تربیت"

---

[1] ۔ابو عبید، کتاب الاموال، ادارہ تحقیقات اسلامی، رقم الحدیث: 119

ہے۔ اس لفظ کے تحت افراد، خاندان اور معاشرہ کی تربیت شامل ہے۔ ان سب اقسام کی تربیت کا اصل مقصد عمدہ، پاکیزہ، بااخلاق اور باکردار معاشرہ کا قیام ہے۔ تربیتِ اولاد بھی اُنہیں اقسام میں سے ایک اہم قسم ہے۔[1]

بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، ان کی صحیح تربیت کر کے ہی مستقبل کے ایک اچھے اور مضبوط معاشرے کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔۔بچوں کی اچھی تربیت سے ایک مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے کیونکہ ایک اچھا پودا ہی مستقبل میں تناور درخت بن سکتا ہے۔

بچپن کی تربیت کے نقوش اَن مٹ ہوتے ہیں۔ اگر بچپن میں ہی بچوں کی صحیح دینی واخلاقی تربیت کر دی جائے تو بڑے ہونے کے بعد بھی وہ ان پر عمل پیرا رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر درست طریقہ سے ان کی تربیت نہ کی گئی تو جوانی میں ان سے بھلائی کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ مزید یہ کہ جوانی میں وہ جن برے اخلاق واعمال کا ارتکاب کرے گا، اس کے ذمہ دار اور قصوروار والدین ہی ہوں گے۔ اولاد کی اچھی اور دینی تربیت دنیا میں والدین کے لیے نیک نامی کا باعث اور آخرت میں کامیابی کا سبب ہے جبکہ نافرمان اولاد دنیا میں بھی والدین کے لیے وبالِ جان ہو گی اور آخرت میں بھی رسوائی کا سبب بنے گی۔ چنانچہ تربیت کی دو مشہور قسمیں ہیں: ظاہری تربیت اور باطنی تربیت۔[2]

ظاہری اعتبار سے تربیت میں اولاد کی ظاہری وضع قطع، لباس، کھانے، پینے، نشست وبرخاست، میل جول، اس کے دوست واحباب اور تعلقات ومشاغل کو نظر میں رکھنا، اس کے تعلیمی کوائف کی جانکاری اور بلوغت کے بعد اس کے ذرائع معاش کی نگرانی جیسے امور شامل ہیں، یہ تمام امور اولاد کی ظاہری تربیت میں داخل ہیں۔ اور باطنی تربیت سے مراد اس کے عقیدہ اور اخلاق کی اصلاح ودرستگی ہے۔[3]

اولاد کی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی تربیت والدین کے ذمہ فرض ہے۔ اسلام اولاد کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے واضح احکامات دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

---

[1] ۔ علوی، محمد شفیق الرحمن، اولاد کی ظاہری وباطنی تربیت کی اہمیت و انداز، ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ6، جلد:100، شعبان1437 ہجری مطابق جون 2016ء، http://www.darululoom-deoband.com

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ ایضا

﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ [1]

"اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔"

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو فرائض شرعیہ اور حلال و حرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کی کوشش کرے۔ تربیتِ اولاد کے حوالے سے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَانَحَلَ ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" [2]

"کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ اس کو اچھے آداب سکھادے۔"

گویا کہ اچھی تربیت کرنا اور اچھے آداب سکھانا اولاد کے لیے سب سے بہترین عطیہ ہے۔

والدین کی کفالت کا شرعی حکم

والدین کی کفالت اولاد پر فرض ہے۔ یہ اولاد کے لیے ضروری ہے کہ جب والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی مالی اور جسمانی خدمت کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور حسن سلوک سے پیش آنا لازمی ہے۔ یہ والدین کا حق ہے اور اولاد کا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں کم و بیش چار مواقع پر اللہ تعالیٰ نے والدین کے اس حق کو اپنے حق کے فوراً بعد بیان کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں والدین کے حقوق کی کس قدر اہمیت ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [3]

"اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔"

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کی زیارت کرنا، ان کو ملنے جانا، ان کے لیے اپنا مال خرچ کرنا، ان کے حقوق کا خیال رکھنا، ان کے پسندیدہ امور کو بجالانا اور ان کی ناپسندیدگی سے بچنا، نافرمانی نہ کرنا اور ان کو اپنے قول و

---

[1] ۔ التحریم66: 6

[2] ۔ ترمذی،محمد بن عیسیٰ، الجامع، باب ماجاء فی قبول الهدية والمكافأة عليها،تحقيق:بشار عواد معروف،دارالغرب الاسلامی،1998م، رقم الحديث: 1952

[3] ۔ بنی اسرائیل17 : 23

فعل سے اذیت نہ دینا وغیرہ یہ تمام امور اس میں شامل ہیں۔ اس ضمن میں والدین کے مختلف حقوق کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

حسن سلوک کا حق

والدین سے حسن سلوک کو اسلام نے اپنی اساسی تعلیم قرار دیا ہے۔ اور ان کے ساتھ مطلوبہ سلوک بیان کرنے کے لیے "احسان" کی جامع اصطلاح استعمال کی جس کے معنی کمال درجہ کا حسن سلوک ہے۔ والدین کے ساتھ نیکی یا احسان کرنا ایک جامع کلمہ ہے جو ہر قسم کے خیر اور پسندیدہ فعل کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسلام نے ہر مرد اور عورت پر اپنے ماں باپ کے حقوق ادا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ والدین کے حقوق کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [1]

"اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو۔ اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں "اف" بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑے ادب سے بات کیا کرو اور ان دونوں کے لیے نرم دلی سے عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھو اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے رہو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے (رحمت و شفقت سے) پالا تھا۔"

احادیث مبارکہ میں بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے مروی واضح حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] ۔ الاسراء 17 : 23 ، 24

"ان الله يوصيكم بامهاتكم ثلاثا ان الله يوصيكم بابآئكم" [1]

"اللہ تعالیٰ تمھیں وصیت کرتے ہیں یہ کہ تم اپنی ماؤں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ (پھر فرمایا) کہ اللہ پاک تمھیں وصیت کرتے ہیں یہ کہ تم اپنے باپوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

والدین سے نیکی کا حکم مطلقاً اور بلا قید ہے ایسا نہیں کہ والدین نیک ہوں تو ان کے ساتھ بھلائی کی جائے اور نیک نہ ہوں تو بھلائی نہ کی جائے، ایسی کوئی شرط نہیں۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین سے بھلائی کو احسان سے تعبیر کیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا﴾ [2]

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔"

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

"ووصينا الانسان بوالديه احسانا" لفظ وصیت تاکیدی حکم کے معنی میں آتا ہے اور احسان بمعنی حسن سلوک ہے جس میں ان کی خدمت و اطاعت بھی داخل ہے اور تعظیم و تکریم بھی۔"[3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کی خدمت مدارت کی جائے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کیا جائے۔

اطاعت و فرمانبرداری کا حق

انسان کے لیے سب رشتوں میں سے سب سے قریبی رشتہ والدین کا رشتہ ہوتا ہے۔ اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو بھی ضروری قرار دیا ہے کیونکہ ان کی نافرمانی

---

[1] ۔ ابن ماجه، السنن، محمد بن يزيد، كتاب الادب، باب بر الوالدين، دار احياء الكتب العربيه، رقم الحديث:3441

[2] ۔ الاحقاف، 46: 15

[3] ۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، 803:7

کبیرہ گناہ ہے۔[1] والدین کی خدمت اور اطاعت سے اولاد کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔

عن ابن عمر ان رجلا اتی النبیﷺ فقال: یا رسول اللہﷺ انی اصبت ذنبا عظیما فھل لی توبۃ؟ قال: ھل لک من ام؟ قال: لا، قال: ھل لک من خالۃ؟ قال : نعم۔ قال: فبرھا۔[2]

"ابن عمر سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے۔ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیری ماں ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری خالہ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے کہا تو اس کے ساتھ نیک سلوک کر۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت کرنے سے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ آج کی اولاد اپنے والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیجنے کی بجائے ان کو گھروں میں اپنے ساتھ رکھ کر، ان کی خدمت کر کے اور ان سے حسنِ سلوک کر کے اپنے گناہ معاف کرا سکتی ہے۔

خدمت کا حق

والدین کی خدمت اور تعظیم و تکریم عمر کے ہر حصے میں واجب ہے بوڑھے ہوں یا جوان، لیکن بڑھاپے کا ذکر خصوصیت سے ہے کہ اس عمر میں جا کر ماں باپ بھی بعض مرتبہ چڑچڑے ہو جاتے ہیں اور عقل و فہم بھی جواب دینے لگتی ہے اور انہیں طرح طرح کی بیماریاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ وہ خدمت کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان کی خواہشات و مطالبات بھی کچھ ایسے ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت (یعنی بچپن کا زمانہ) یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے۔[3] جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انہوں نے اپنی راحت و خواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے

---

[1] ۔بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر، رقم الحدیث: 5976

[2] -ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، الجامع، دار الغرب الاسلامی، بیروت، 1998ء، کتاب البر و الصلۃ، باب ما جاء فی برالخالۃ ،رقم الحدیث: 1904

[3] ۔ الاسراء17 : 23 ، 24

ساتھ برداشت کیا تو اب جب ان پر محتاجی کا وقت آیا ہے تو عقل و شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو۔ جس طرح قرآن حکیم میں والدین کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح کئی احادیثِ مبارکہ میں بھی والدین کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رغم انف، ثم رغم انف، ثم رغم انف۔ قيل من يا رسول اللهﷺ قال من ادرک ابويه عند الكبر احدهما او كليهما فلم يدخل الجنة" [1]

"اس کی ناک غبار آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو (یعنی ذلیل و رسوا ہو)۔ عرض کیا گیا: کون یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ماں باپ دونوں کو یا کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ والدین کی خدمت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اولاد میں سے ہر ایک کا فریضہ اور والدین کا حق ہے۔

مال میں تصرف کا حق

اولاد نے جو مال کمایا ہو وہ والدین کا مال بھی ہے۔ والدین نے اولاد کو پال پوس کر بڑا کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ مال کما سکے تو بڑھاپے میں والدین کمزور، ناتواں اور محتاج ہوں تو اس لیے جب والدین کو ضرورت پڑے تو وہ اولاد کے مال میں سے لے سکتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

"ان رجلا اتى النبیﷺ فقال: يا رسول اللهﷺ ان لی مالا وولداً وإن والدی يحتاج مالی۔ قال: انت و مالک لوالدک۔ ان اولادكم من اطيب كسبكم فكلوا من كسب اولادكم" [2]

"ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میرے پاس مال ہے اور میرا والد میرے مال کا محتاج ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے۔ تمھاری اولاد تمھاری پاکیزہ کمائی ہے سو تم اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ۔"

---

[1]۔ مسلم، الجامع الصحيح، كتاب البر و الصلة، باب رغم أنف من أدرک أبويه، رقم : 2551

[2]۔ ابو داؤد، السنن، كتاب البيوع، باب فی الرجل ياكل من مال ولده، رقم الحديث: 3530

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد کا مال والدین کا مال ہے۔ اگر اولاد خود کو اور اپنے مال کو والدین کا سمجھ لے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے۔ لیکن آج کل معاشرہ اس کے برعکس ہے۔ مرد حضرات جو کماتے ہیں وہ سارے کا سارا بیوی کو دے دیتے ہیں جو جہاں چاہے جیسے چاہے اسے خرچ کر سکتی ہے مگر والدین کو دینا گوارا نہیں کرتی۔ ماں باپ کو اس کمائی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ والدین کے حقوق میں سب سے بڑا حق بڑھاپے میں ان پر خرچ کرنا ہے۔ بیٹا خواہ مال دار ہو یا تنگ دست، اگرچہ والدین کا مذہب مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ والدین کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے۔ خواہ والدین دائمی مریض ہوں اور کمائی نہ کر سکتے ہوں یا صحت مند ہوں اور کمائی کر سکتے ہوں، یہ نفقہ معروف طریقے سے واجب ہے۔ البتہ نیکی اور احسان یہی ہے کہ والدین پر اچھے طریقے سے خرچ کیا جائے۔ اور آدمی جو چیز اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لیے پسند کرتا ہے وہی چیز بلکہ اس سے بہتر اپنے والدین کے لیے پسند کرے۔ یہ رویہ مناسب اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہو اور اس کے والدین اولڈ ایج ہومز میں دوسروں کے سہارے پر تنگ دستی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔

سورہ نساء میں والدین کے ساتھ احسان کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [1]

"اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرو۔"

لباس کا حق

لباس انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کا مقصد ستر پوشی کے ساتھ ساتھ زینت کا اظہار بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا﴾ [2]

"اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو بھی

---

[1] ۔النساء4: 36

[2] ۔ الاعراف 7: 26

چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔"

لباس کی فراہمی بھی بنیادی ضروریات زندگی میں شامل ہے۔ اولاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق لباس کا اہتمام کرے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"جو شخص کسی مسلمان کو احتیاجِ لباس کی صورت میں کپڑا پہنائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا سبز ملبوس پہنائے گا۔"[1]

گویا کسی کی ستر پوشی کے لیے اس کو لباس فراہم کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے کہ اس انسان کو اللہ تعالیٰ جنت کی پوشاک پہنائیں گے۔ یہ تو کسی عام انسان کے لیے اس کا صلہ ہے تو اگر کوئی والدین کے ساتھ اس کا مظاہرہ کرتا ہے تو والدین کے ساتھ بھلائی کی وجہ سے زیادہ اجر کا مستحق ہے۔

خوراک کا حق

خوراک کے بغیر انسانی زندگی کی بقا ممکن نہیں ہے۔ کسی بھوکے شخص کو کھانا کھلا کر اس کی بھوک ختم کرنا بڑے اجر کا کام ہے۔ سنن بیہقی میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی فاقہ زدہ مسلمان کو کھانا کھلانا مغفرت کو واجب کر دینے والے اعمال میں سے ایک ہے۔[2]

بھوکے کو کھانا کھلانا ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اسی طرح سے والدین کے لیے خوراک کی فراہمی یقینی بنانا اولاد کا فرض ہے۔ اولاد خود عیش کر رہی ہو اور اس کے والدین فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو یہ اولاد کے لیے بہت شرمندگی کی بات ہے۔

رہائش کا حق

والدین کی رہائش و سکونت کا بندوبست کرنا اولاد کا فرض ہے۔ رہائش کی فراہمی کی اہمیت اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اسے اپنی رحمت کے طور پر بیان کیا ہے:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا

---

[1] ۔ابو داؤد، السنن، رقم الحدیث: 1682

[2] ۔ ترمذی، الجامع، رقم الحدیث: 2449

تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ [1]

"اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے گھروں میں سکونت کی جگہ بنادی ہے اور اسی نے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں کے گھر بنا دیئے ہیں، جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے ٹھہرنے کے دن بھی، اور ان کی اون اور روؤں اور بالوں سے بھی اس نے بہت سے سامان اور ایک وقت مقررہ تک کے لیے فائدہ کی چیزیں بنائیں۔"

والدین کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا اور بے بس نہ چھوڑ دیں بلکہ اپنے ساتھ ان کی رہائش کا بھی بندوبست کریں تاکہ وہ عزت و وقار سے ایک چھت کے نیچے رہ سکیں۔

والدین کی اجازت سے جہاد میں شرکت

والدین کے حقوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ والدین کی خدمت ہی اولاد کے لیے جہاد کا درجہ رکھتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ:

عن عبدالله بن عمرو قال: جآء رجل الیٰ رسول اللهﷺ فاستاذنه فی الجهاد فقال: احی والداک؟ قال: نعم۔ قال ففیهما فجاهد. [2]

"عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد میں جانے کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں میں جہاد کر (یعنی ان کی خدمت کر)۔"

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: اپنے ماں باپ کے پاس جا اور ان کی اچھی طرح خدمت کر۔

ایک روایت میں تو جہاد کی ادائیگی کے لیے والدین کی اجازت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

"ان رجلا هاجر الی رسول اللهﷺ من الیمن۔ قال: هل لک احد بالیمن؟ قال: ابوای۔ قال اذنا لک؟ قال: لا۔ قال: ارجع الیهما فاستاذنهما فان اذنا لک

---

[1] ۔ النحل 16: 80

[2] ۔بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجهاد، باب جهاد باذن الابوین، رقم الحدیث:3004

فجاهد و الا فبرهما." [1]

"ایک آدمی یمن سے ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یمن میں تمھارا کوئی رشتہ دار ہے؟ اس نے کہا میرے والدین ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم نے والدین سے یہاں آنے کی اجازت لی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ اور اپنے والدین سے اجازت لو۔ اگر وہ تجھے اجازت دیں تو ہمارے ساتھ مل کر جہاد کرو ورنہ والدین کے ساتھ نیکی کرو۔"

گویا جہاد جیسے دینی فریضے کی ادائیگی کے لیے بھی والدین کی اجازت ضروری قرار دی گئی ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ جب ماں باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک منع کر دے تو جہاد حرام ہے بشرطیکہ وہ دونوں مسلمان ہوں کیونکہ ان سے حسن سلوک اس پر فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ البتہ جب جہاد فرض عین ہو جائے تو اجازت کی ضرورت نہیں۔

والدین کی اجازت اسی لیے لازم قرار دی گئی ہے کہ اولاد والدین کی خدمت میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کرے۔ مگر آج اولاد والدین کی خدمت سے منہ موڑ کر انہیں اولڈ ایج ہومز میں بھیج دیتی ہے۔ یہ فعل اسلام میں کس طرح پسندیدہ ہو سکتا ہے؟

جنت والدین کے قدموں تلے

والدین کی خدمت سے جنت کا حصول ممکن ہے۔ والدین کی طاعت و فرمانبرداری کرنے سے دنیا میں تو فائدہ ہوتا ہی ہے آخرت میں بھی اس کا بڑا انعام ہے کہ انسان جنت حاصل کر لیتا ہے۔ روایت ہے:

عن معاوية بن جاهمه ان جاهمة جآ ء الیٰ النبیﷺ فقال: یا رسول اللهﷺ اردت ان اغزو و قد جئت استشیرک فقال: هل لک من أم؟ قال : نعم۔ قال: فالزمها فان الجنة تحت رجلیها [2]

"معاویہ بن جاہمہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد جاہمہ رسول پاک ﷺ کے پاس آئے اور

---

[1] -ابوداؤد، السنن، کتاب الجهاد، باب فی رجل یغزو و ابواه کارهان، رقم الحدیث: 2530

[2] ۔ نسائی،عبدالرحمن احمد بن شعیب، السنن، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له و الدة، دار الکتب العلمیه، بیروت، رقم الحدیث: 3104

آپ ﷺ سے سوال کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ ﷺ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیری ماں (زندہ) ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو اس کی خدمت کر کہ بے شک جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔"

والدین کے قدموں کے پاس یا قدموں تلے جنت ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری سے اللہ تعالیٰ انسان کو جنت عطا فرما دیتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ:

"الوالد اوسط ابواب الجنة فان شئت فاضع ذلک الباب اواحفظه" [1]

"والد جنت کا بہترین دروازہ ہیں یہ تیری مرضی ہے کہ تو اس دروازے کو ضائع کر دے (یعنی ان کو ناراض کر کے) یا اس کی حفاظت کرے (یعنی ان کی خدمت کر کے، ان کو خوش کر کے)۔"

اس حدیث کے مطابق ماں باپ جنت کا سب سے بہترین دروازہ ہیں۔ یعنی جنت میں جانے کا سب سے بہترین عمل والدین کی خدمت اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ مگر آج وہ لوگ کس قدر بد نصیب ہیں جو اپنے والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیج دیتے ہیں یا گھر سے نکال کر خود اپنے ہاتھوں اپنی جنت دور کر رہے ہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"رغم انف ثم رغم انف ثم رغم انف قيل من يا رسول اللهﷺ قال من ادرک ابويه عند الكبر احدهما او كليهما فلم يدخل الجنة."

"اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو (یعنی رسوا ہو) جو اپنے ماں باپ دونوں کو یا کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں نہ جائے" [2]

سو ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے لازم ہے کے اولاد اپنے والدین کے تمام حقوق کو ادا کرے اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔

---

[1] ۔ترمذی، الجامع، كتاب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدين، رقم الحديث: 1900

[2] ۔ مسلم، الجامع الصحيح، كتاب البر و الصلة و الادب، باب رغم انف من ادرک۔۔۔يدخل الجنة، رقم الحديث:2551

والدین کی خدمت: کامیابی اور فضیلت کا باعث

والدین کی اطاعت انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی محبوب بناتی ہے اور انسانوں کے درمیان بھی۔ حضرت اویس قرنیؒ کو نبی کریم ﷺ سے بہت محبت تھی اور آپ ﷺ بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ حضرت اویس قرنیؒ اگرچہ صحابیت کے شرف سے اپنی ماں کی اطاعت و فرمانبرداری کی وجہ سے محروم رہے لیکن اس کے باوجود اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں پسندیدہ تھے اور اللہ کے ہاں مستجاب الدعوات تھے۔ روایات میں بھی ان کی فضیلت بیان کی گئی ہے:

"إن خير التابعين رجل يقال له أويس، وله والدة، وكان به بياض، فمروه فليستغفر لكم" [1]

"تابعین میں سے بہترین انسان وہ شخص ہے جسے اویس کہتے ہیں، اس کی والدہ (زندہ) ہے اور اس (کے جسم) میں سفیدی ہے۔ اس سے کہو کہ تمہارے لیے دعا کرے۔"

گویا انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہونے اور مستجاب الدعوات ہونے کے لیے والدین کی خدمت کرے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔

دنیاوی مشکلات سے چھٹکارا

والدین کے حقوق کو ادا کرنے والا اور ان سے حسن سلوک کرنے والا مصائب اور مشکلات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ والدین کی دعائیں بھی اپنی اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔ والدین کا فرمانبردار جب کسی تکلیف اور پریشانی میں اللہ کو پکارتا ہے تو وہ اس کی ضرور سنتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل میں تین آدمی ایک غار میں پھنس گئے ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے نیک کام کا واسطہ دے کر اللہ سے غار کا راستہ کھولنے کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مشکل سے نجات دلائی۔ ان میں سے ایک والدین کا خدمت گزار تھا۔ روایت میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:

"عن ابن عمر عن رسول اللهﷺ قال: بينما ثلاثة نفر يتماشون اخذهم المطر فمالوا الىٰ غار فى الجبل فانحطت على فم غارهم صخرة من الجبل فاطبقت

---

[1] ۔ مسلم، الجامع الصحيح، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل اويس القرني، رقم الحديث: 6491

عليهم فقال بعضهم لبعض: انظروا اعمالا عملتموها لله صالحة فادعوا الله بها لعله يفرجها۔ فقال احدهم، اللهم انه كان لی... ففرج الله لهم فرجة حتى يرون منها السمآء" [1]

"ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ (بنی اسرائیل کے) تین اشخاص راستے میں جارہے تھے کہ اتنے میں بارش شروع ہوگئی اور وہ پہاڑ کی ایک غار میں گھس گئے۔ اتفاقاً پہاڑ کا ایک پتھر غار کے منہ پر آگرا اور غار کا منہ بند ہوگیا وہ آپس میں صلاح کرنے لگے ایک نے کہا بھائی ایسا کرو کہ تم لوگوں نے جو نیک اعمال خالص اللہ کے لیے کیے ہیں ان کے ذریعے سے دعا مانگو شاید اللہ مشکل آسان کردے اور تم کو نجات دلادے۔ پھر ان تینوں میں سے ایک شخص یوں کہنے لگا یا اللہ! تو جانتا ہے میرے ماں باپ دونوں بوڑھے تھے اور میرے بچے بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان کی پرورش کے لیے جانوروں کو چرایا کرتا تھا جب شام کو گھر آتا تو دودھ دوہتا تو سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو پلاتا تھا، پھر اپنے بچوں کو۔ ایک دن ایسا ہوا جانور دور چرنے کے لیے چلے گئے اور مجھ کو دیر ہوگئی میں شام تک نہیں آیا۔ (جب گھر پہنچا) دیکھا تو میرے والدین سو گئے تھے۔ میں نے عادت کے مطابق دودھ دوہا اور صبح تک دودھ لیے ان کے سرہانے کھڑا رہا۔ مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ ان کو نیند سے جگاؤں اور نہ میں نے اس کو پسند کیا کہ پہلے بچوں کو دودھ دوں، گو رات بھر بچے میرے پاؤں کے پاس روتے اور دودھ مانگتے رہے (مگر میں نے نہ دینا تھا نہ دیا) صبح تک یہی حال رہا اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام خالص آپ کی رضا کے لیے کیا تھا تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر کو اتنا ہٹا دیا کہ وہ آسمان دیکھنے لگے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت کرنے سے اللہ دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں سے بھی نجات دے دیتا ہے۔ جو لوگ اپنے والدین کو اپنے سے دور کرکے نہ ان کی خدمت کرتے نہ ان کی دعائیں لیتے ہیں وہ کس طرح اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں؟ الغرض اسلام نے والدین کے حقوق صرف ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں رکھے بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی اولاد پر ذمہ داریاں ڈالی ہیں جیسے کہ ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام

---

[1] ۔بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب اجابة دعا من بر و الدیة، رقم الحدیث: 5974

کرنا، ان کے قرض کی ادائیگی کرنا، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا[1]، ان کے لیے صدقہ و خیرات کرنا، ان کے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا وغیرہ۔ اگر اولاد ان کی زندگی مین ان کے حقوق ادانہ کرے تو ان سے کس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ وہ وفات کے بعد ان کے حقوق پوار کریں گے اور ان کے لیے صدقہ جاریہ بن سکیں گے؟

عصر حاضر میں اولاد کا عملی رویہ

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ اولڈ ایج ہومز کے قیام کا اصل مقصد لاوارث اور بے سہارا بوڑھے افراد کو سہارا فراہم کرنا اور ان کی کفالت کرنا ہے مگر آج وہ لوگ جن کے لیے اولاد کا سہارا بھی موجود ہے اور ان کی اولاد معاشی لحاظ سے مستحکم بھی ہے وہ بھی اپنی اولاد کی نافرمانی، غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے اولڈ ایج ہومز میں منتقل کیے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے سرکاری و نجی سطح پر اولڈ ایج ہومز کے قیام میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دور جدید میں ایسے واقعات بھی سامنے آرہے ہیں جن پر انسانیت بھی شرما جائے۔ سما نیوز کے مطابق کراچی سٹی کورٹ میں نافرمان اولاد نے بھری عدالت میں ماں باپ پر ہاتھ اٹھایا۔ بیچ بچاؤ کرانے والے پولیس کانسٹیبل کو بھی زخمی کر دیا گیا۔[2] اس ضمن میں موجودہ دور میں اولاد کے رویے اور اس کے اس اسباب کو ہم مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کرنے کی کوشش کریں گے:

- تعلیمات اسلام سے روگردانی
- خانگی مسائل
- خود غرضی ومادہ پرستی
- عیش و آرام

تعلیمات اسلام سے روگردانی

خاندانی نظام میں والدین اور اولاد کا رشتہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس رشتہ کی مضبوطی کے لیے اللہ تعالیٰ

---

[1]. ابراہیم، 41:14

[2]۔ سما ڈیجیٹل، 14 مئی 2014، Retrieved 2 May 2019, 5:04pm www.sama.tv

نے ماں باپ اور اولاد کے درمیان فطری طور پر ایسی محبت اور اپنائیت رکھی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رشتہ کو مزید مضبوط اور مستحکم کرتی ہے۔ اس مضبوطی اور استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں پر حقوق و فرائض عائد کیے ہیں کہ جب تک اولاد اپنی پرورش، تعلیم و تربیت اور اخراجات کے لیے محتاج ہے تب تک ان کی کفالت کی تمام تر ذمہ داری والدین پر اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ اسی طرح جب والدین زندگی کے اس موڑ پر آجائیں کہ وہ کمزور، لاچار اور محتاج ہوں تو ان کی کفالت کی تمام تر ذمہ داری جوان اولاد پر ڈالی ہے اور اولاد کے حق میں اسے ایک دینی فریضہ قرار دیا ہے۔ اسلام نے فریقین کو اپنے اپنے فرائض پورا کرنے کے لیے قانوناً پابند بنایا ہے اور مزید بہتری کے لیے فضیلت و رغبت کا طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف اولاد کی پرورش اور تربیت پر والدین کو صدقہ جاریہ اور جنت کی خوشخبری سنائی تو دوسری طرف اولاد کو بتایا ان کی خدمت گزاری سے جنت حاصل کر سکتی ہے کیونکہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے اور باپ جنت کا دروازہ ہے۔ اور ان کی نافرمانی کا نتیجہ جہنم ہے۔ اسلام نے اولاد کے لیے والدین کی نافرمانی کو حرام اور ذلت و رسوائی کا باعث قرار دیا ہے مگر آج اولاد کی اکثریت حقوق و فرائض سے متعلق اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال چکی ہے جس کی وجہ سے اولاد والدین کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتی اور انہیں اولڈ ایج ہومز میں چھوڑ آتی ہے۔

خانگی مسائل

والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیج دینے کی ایک وجہ خانگی مسائل یا گھریلو ناچاکی ہے۔ کیونکہ بچے جوان ہونے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوا ہوتا ہے کہ والدین کو مناسب وقت نہیں دے پاتا۔ والدین اس کے گھر آنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب بیٹا گھر آئے اور وہ ان کے ساتھ اپنے دل کی باتیں شیئر کر سکیں مگر بیٹا گھر آنے کے بعد اپنے آرام اور بیوی بچوں کو وقت دینا زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والدین کی ہدایات کو بے جا مداخلت سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ساس بہو میں انا کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جو گھر کے ماحول میں تناؤ کا باعث بنتا ہے۔ وہ دونوں رشتوں کو ان کا حق نہیں دے پاتا۔ ماں کو خوش کرنے لگے تو بیوی ناراض اور اگر بیوی کو خوش کرے تو ماں ناراض ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال میں بیٹے کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ کس کو چھوڑے اور کس کو ساتھ رکھے تو بالآخر اسے اس مسئلہ کا حل

والدین کو اولڈ ایج ہومز میں چھوڑ آنے میں نظر آتا ہے۔

خود غرضی و مادہ پرستی

ماں باپ اپنی اولاد کو پانے کے لیے جو قربانیاں دیتے ہیں ان سے انکار ممکن نہیں۔ وہ حسن و خوبی سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھا کر، بھرپور توجہ اور محبت سے کمزور و ناتواں اولاد کو پڑھا لکھا کر مضبوط و توانا بناتے ہیں۔ اپنی کمزور اولاد کو توانا بنانے والے یہ والدین اس وقت بڑے کرب سے گزرتے ہیں جب ان کی اولاد کسی تکلیف میں ہوتی ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ اپنی اولاد کی تکلیف، درد کو اپنے سر لے کر اولاد کو آسودہ اور مطمئن کر دیں۔ مگر آج کے دور میں بچوں کی خاطر قربانیاں دینے والے، اپنی آسائشوں کو اولاد کی آسائشوں پر ترجیح دینے اور ان کی تکلیفوں کو دور کرنے والے والدین اولاد کی خود غرضی، بے رخی اور مفاد پرستی کا شکار ہیں۔ اولاد اپنی آسائش، اپنے سکون و آرام اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے والدین سے منہ موڑ رہی ہے۔ نئی نسل کے مادہ پرست ہونے کی وجہ ہے ان کا والدین سے برتاؤ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ صبر اور برداشت میں کمی ہو گئی ہے اور والدین کو اولڈ ایج ہومز میں چھوڑنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں والدین کے کرب کا اندازہ لگانا ناممکن ہے جو اپنی اولاد کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں لیکن اولاد مادی مفادات کے لیے والدین کی نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ مجبوراً والدین کو اپنا بڑھاپا تنہا اور غیروں کے سہارے گزارنا پڑتا ہے۔ پیسے کی دوڑ میں زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ اولاد کے پاس بوڑھے والدین کے لیے وقت نہیں جس سے والدین کی دیکھ بھال کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

عیش و آرام

موجودہ دور کی نسل اپنی زندگی کو خوش گوار، معیاری، عیش و عشرت والی زندگی بنانے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے اپنے بزرگوں کو سہارا دینے کی فرصت نہیں۔ ایک باپ دس بچوں کو اکیلے پال پوس کر جوان کرتا ہے مگر دس بچوں کے لیے ایک باپ کی ذمہ داری اٹھانا مشکل ہو گیا ہے۔ اپنی سہولت کے لیے وہ والدین کو بھول جاتے ہیں، ان سے نظریں چرا لیتے ہیں اور عیش و آرام میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے ماں باپ کے دکھ درد اور تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ ماں باپ کے آنسو دکھائی دیتے ہیں نہ ان کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔

عدم جواز کی صورتیں

والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیجنے کی ہر وہ صورت ناجائز ہو گی جس کا مظاہرہ اولاد ان کی حق تلفی کرتے ہوئے کرے جیسے ان کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت میں لاپرواہی برتنا۔ ذیل میں والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیجنے کی ناجائز صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

1۔ والدین سے بے اعتنائی

2۔ والدین کی بجائے بیوی اور اولاد کو ترجیح دینا

3۔ خدمت میں کوتاہی

4۔ بنیادی ضروریات کی فراہمی

خلاصۂ بحث

والدین کی خدمت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی چیز نہیں۔ انسان کو اعلیٰ درجات اور فضیلتیں اسی ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر روزہ، نماز اور حج جیسی عبادات میں کوئی کمی واقع ہو جائے تو اللہ کی ذات درگزر کرنے والی ہے مگر ماں باپ کی خدمت میں تساہل اور غفلت برتنے سے انسان کے سارے اعمال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ عبادات اپنی جگہ لیکن والدین کی خدمت کا کوئی اور بدل نہیں ہو سکتا۔ والدین کی کفالت کے حوالے سے جس قدر تفصیل کے ساتھ اسلامی تعلیمات میں رہنمائی ملتی ہے کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ ماں باپ کی خدمت، اطاعت اور فرمانبرداری مسلمان اولاد کا دینی فریضہ ہے جس سے روگردانی کرنا کسی طرح سے بھی جائز نہیں ہے۔ والدین اپنے بچوں کی پرورش کرتے انہیں تعلیم دلواتے، اور ان کی تربیت کرتے ہیں لیکن آج کے دور میں تمام تر شعور اور تعلیم رکھنے کے باوجود بچے اپنے والدین کو بوجھ سمجھ کر ان کی طرف نظرِ التفات نہیں کرتے اور انہیں گھروں سے نکال دیتے ہیں۔ والدین کے ساتھ ایسا رویہ کرنے والے اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر لیتے ہیں۔ وہ گھرانے جہاں والدین کی کفالت ہوتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور ان کے رزق میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرماتا ہے۔ ایسے گھروں میں سارا سلسلہ خوش اسلوبی سے چلتا ہے کیونکہ اولاد ہر معاملے میں والدین سے مشورہ اور رہنمائی لیتی ہے، ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے اور ان کے تجربات کی روشنی میں معاملات کو انجام دیا جاتا ہے۔ والدین کی دعائیں ساتھ ہوتی ہیں۔ اولاد اور والدین کی محبت اور خلوص کی وجہ سے

گھر کا ماحول پر سکون ہوتا ہے اس کے برعکس وہ گھرانے جہاں والدین کی عزت نہیں کی جاتی۔ ان کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے مفاد کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ رزق اور سکون کی کمی ہو جاتی ہے اور خاندان کا نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیجنے کا تصور مغرب سے لیا گیا ہے جہاں والدین کو کوئی عزت نہیں دی جاتی۔ اولاد ماں باپ کی نافرمان ہوتی ہے اور اپنی زندگی میں اس قدر مصروف کہ والدین کی گھر میں موجودگی اسے بوجھ محسوس ہوتی ہے اس لیے ان کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں جگہ جگہ اولڈ ایج ہومز اور نرسنگ ہومز کھل گئے ہیں جہاں سرکاری خرچ پر بوڑھوں کی کفالت ہوتی ہے۔ وہ والدین اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کرتے ہیں جن کی اولاد ان کو ہفتے میں ایک بار پھولوں کا تحفہ دینے آجاتی ہے۔ گھروں میں بزرگوں کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں خاندانی نظام برباد ہو چکا ہے۔ ہمارے معاشرے نے اگر ان کی روش کو نہ چھوڑا تو ہمارے معاشرے کا حال بھی مغرب جیسا ہو گا۔ آج کی نسل اگر اپنے والدین کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے تو کل اس کی اولاد بھی اس کے ساتھ یہی رویہ اپنائے گی کیونکہ جو آج کسی کا بڑھاپے میں سہارا بنے گا تو کل کوئی اور بھی بڑھاپے میں اس کا سہارا بنے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا لِسِنِّهِ إِلَّا قَيَّضَ اللَّهُ لَهُ مَنْ يُكْرِمُهُ عِنْدَ سِنِّهِ" [1]

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو نوجوان کسی بوڑھے کے عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جوان کے لیے کسی کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت کرتا ہے۔"

اس لیے اولاد کو چاہیے کہ والدین کی عزت اور خدمت کرے تا کہ کل کو اس کا اپنا بڑھاپا بھی سکون سے گزرے اور اللہ کی رضا کے ساتھ وہ دنیا اور آخرت میں بھی سرخرو ہو۔

---

[1] ۔ترمذی، الجامع، کتاب البر و الصلة، باب یکرم شیخا، رقم الحدیث:2111

تجاویز و سفارشات

اس سلسلے میں کچھ تجاویز پیش خدمت ہیں تا کہ معاشرے کے اندر اولڈ ایج ہومز کا بڑھتا ہوا رجحان کم ہو:

- والدین کی کفالت اولاد کی ذمہ داری ہے لہٰذا ہر شخص اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسے خود نبھائے اور انہیں دوسروں کے سہارے نہ چھوڑے کیونکہ جس خلوص کے ساتھ اولاد ماں باپ کا خیال رکھ سکتی ہے کوئی اور نہیں رکھ سکتا۔
- دنیا میں سب سے پیارا اور مخلص رشتہ ماں باپ کا ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے فرمودات کے مطابق ابتداء ہی سے بچوں کی تربیت ایسی کی جائے کہ وہ ماں باپ کی خدمت، اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔
- اپنی سرگرمیوں کو اس طرح سے ترتیب دیا جائے کہ والدین کو توجہ اور وقت دیا جا سکے۔
- تمام رشتوں کو ان کا حق دیا جائے اور ان کے مقام کے مطابق ان کو اہمیت دی جائے تا کہ کسی ایک کی وجہ سے کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔
- اگر والدین کو اولڈ ایج ہومز میں بھیجنا ناگزیر ہو تو ان کے پاس باقاعدگی سے جایا جائے تا کہ ان کو اولاد سے دوری کا احساس پریشان نہ کرے۔

کزن میرج کی شرعی و طبّی حیثیت

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

ڈاکٹر حافظ محمد شبیر احمد*

ABSTRACT

The personality of the Holy Prophet Muhammad (SWA) is best role model for the whole humanity as it povides guidance to solve all sorts of problems. One of the issues which is commonly discussed these days among the masses is the marriage between the close relatives, such as cousins, and its effect on the children.

One group of Muslims considers it valid while other holds that it is invalid and harmful. The Arab and non-Arab media as well as social media is active in highlighting these issues and rather disturbing and confusing the innocent people.

Similarly, some Islamic scholars argue for the validity and benefits of such type of marriage while some others oppose it and argue that it is harmful for the children of the couple and for the society at large. They also draw support from certain Ahadith.

When a dispute arise between various factions of the Muslim society, the only viable solution is to return to the teachings of Quran and authentic narrations of the Prophet (SAW) and his Sunnah. In this article we will analyze both the view points and would try to ascertain the better and preferred option.

Key words: کزن میرج، بنی نوع انسان، نمونہ حطمی درع، علتیں، اجنبی عورت

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور

اللہ سبحانہ وتعالی نے ہر زمانے میں بنی نوع انسان کے لیے انبیاء ورسل بھیجے جو ان کی رہنمائی کر سکیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

- ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ﴾[1]

"اور البتہ تحقیق ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجے کہ وہ (لوگ صرف) اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت (کی عبادت) سے بچیں۔"

جیسا کہ اس آخری امت کی رہنمائی کے لیے نبی مکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا جن کا ہر قول وعمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

- ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[2]

"یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ (کی زندگی) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔"

بے شک سیرت النبی ﷺ میں ہر ایک مسلمان کے لیے رہنمائی موجود ہے، عہد نبوی ﷺ سے لے کر عصر حاضر تک بلکہ تا قیامت آنے والے لوگوں کے لیے کسی بھی پہلوئے حیات کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور تعلیمات مشعل راہ ہیں، خواہ وہ پہلو دینی ہو یا دنیاوی، انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا معاشرتی، عائلی ہو یا انفرادی، سفر سے متعلق ہو یا حضر سے، تعلیم سے متعلق ہو یا تربیت سے، الغرض ہر معاملے میں کسی نہ کسی طور پر رہنمائی موجود ہے۔

آج کل میڈیا اور سوشل میڈیا میں یہ بحث جاری ہے کہ کزن میرج (Cousin Marriage) صحیح ہے یا نہیں؟ مسلم معاشرہ ہو یا مغربی، عربی معاشرہ ہو یا عجمی، ان میں سے ایک گروہ اس کے صحیح ہونے کا قائل ہے اپنا موقف قرآن وسنت اور سیرت نبوی کی روشنی میں واضح کرتا ہے اور اعتراضات کا مدلّل جواب دیتا نظر آتا ہے۔

اور دوسرا گروہ اسے صحیح نہیں گردانتا بلکہ اسے بنی نوع انسان کی صحت کے لیے زہر قاتل تصور کرتا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ وہ عقلی تصورات سے استدلال کرتا نظر آتا ہے۔ ان دونوں فریقوں کے دلائل ونصوص کا اس مضمون میں جائزہ لیا جائے گا۔

---

[1]- النحل 36:16

[2]- الاحزاب 33: 21

اس میں کوئی شک نہیں کہ نکاح کرنا سنت نبوی اور ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس سے انسانی نسل پروان چڑھتی ہے اور اسی طرف اللہ سبحانہ نے کئی آیات میں اشارہ فرمایا ہے:

- ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاء﴾[1].

"اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد وزن پھیلا دیئے۔"

- ﴿وَاللّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾[2].

"اور اللہ تعالی نے تمہارے لیے تم میں سے تمہاری بیویاں پیدا کیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔"

قرآن کریم میں کئی آیات ایسی ہیں جو نکاح کی اہمیت وضرورت پر دلالت کرتی ہیں اور اس طرح بعض احادیث میں صاحب استطاعت کو شادی کی رغبت دلانے کے ساتھ ساتھ تاکید بھی کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

- ﴿فَانكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاء﴾[3].

"پس تم نکاح کرو ان عورتوں سے جو تمہیں اچھی لگیں۔"

اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ

---

[1]- النساء4: 1

[2]- النحل 16: 72

[3]- النساء 4: 3

بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ" [1]

"اے نوجوانو: تم میں سے جو نکاح کی وسعت رکھتا ہو وہ نکاح کر لے، اور جو نکاح کی وسعت نہیں پاتا وہ روزہ رکھنے کو اپنا معمول بنالے اس لیے کہ یہ (گناہوں سے) بچنے کی ڈھال ہے۔"

مزید ارشاد گرامی ہے:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ»[2]

"شادی کرو زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی سے، پس بے شک میں قیامت کے دن دوسری امتوں پر تمہاری کثرت کی وجہ سے فخر کروں گا۔"

اور ارشاد گرامی ہے:

«النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي، فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»[3]

"شادی کرنا میری سنت ہے، پس جو میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ میرے طریقہ پر نہیں۔"

اس کے ساتھ ساتھ سیرت النبی ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شادی کی رغبت دلائی، جیسا کہ تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مشہور واقعہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق استفسار کیا۔ مختصراً یہ کہ ان میں سے ایک نے کہا تھا: میں کبھی نکاح نہیں کروں گا، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے تو عورتوں سے شادی بھی کی ہے پس جو میری سنت

---

[1]- البخاري، ابو عبدالله، محمد بن اسماعيل، الجامع المسند الصحيح المختصر من أُمور رسول الله وسننه وايامه، دار السلام والنشر والتوزيع الرياض، 2000ء، كتاب النكاح، باب قول النبيﷺ: من استطاع منكم الباءة فليتزوج، رقم الحديث: 5665

[2]- ابو داؤد، سليمان بن اشعث، السنن، دار السلام للنشر والتوزيع الرياض، 2000ء، كتاب النكاح، باب النهى عن تزويج من لم يلد من النساء، رقم الحديث:2050

[3]- ابن ماجة، محمد بن يزيد القزويني، سنن، دار السلام للنشر والتوزيع الرياض، 2000ء ،كتاب النكاح، باب ما جاء في فضل النكاح، رقم الحديث: 1846 صححه الالبانى

پر عمل نہیں کرے گا وہ ہم میں سے نہیں[1]، اور بعض مواقع پر معمولی حق مہر پر ان کی شادی کرادی، جیسے ایک لوہے کی انگوٹھی یا قرآن کریم کے بعض اجزاء یاد کرانے پر شادی کرادی تھی[2]۔

ان دلائل وارشادات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان کے لیے نکاح کرنا جہاں حکم الٰہی کی بجاآوری ہے وہیں سنت نبوی پر عمل کرنا بھی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان مرد کے لیے شریعت اسلامیہ میں کن عورتوں سے نکاح جائز ہے اور کن سے نہیں؟

اگر شریعت اسلامیہ میں ایسی عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ا۔ رشتے دار عورتیں

ب۔ اجنبی عورتیں

اجنبی عورتوں سے نکاح کرنا بالاتفاق جائز ہے اگر شرعی یا طبی ممانعت نہ ہو، جبکہ رشتے دار عورتوں میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں محرمات کہا جاتا ہے جن سے نکاح کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، جن کا تذکرہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ

---

[1]۔ صحيح البخاری كتاب النكاح باب الترغيب فی النكاح، رقم الحديث: 5063 وصحيح مسلم، كتاب النكاح باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه اليه، رقم الحديث: 1401

اس کے علاوہ اور احادیث بھی ہیں جیسا کہ:

جامع الترمذي، ابواب النكاح باب اذا جاءكم من ترضون دينكم فزوجوه، رقم الحديث 1085 میں ہے: جب تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے دین اور اخلاق سے تم راضی ہو تو اس سے شادی کر دو۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور علامہ البانی نے حسن لغیرہ کہا ہے۔ اور مسند احمد، رقم الحدیث: 13309 وشعب الایمان للبیہقی رقم الحدیث: 2515 میں ہے: کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے کسی صحابی سے پوچھا: کیا تو نے شادی کر لی ہے؟ اس نے کہا نہیں، کیونکہ میرے پاس شادی کے لیے کوئی چیز نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تجھے سورت اخلاص بھی نہیں آتی؟ اس کی سند ضعیف ہے۔

[2]۔ صحيح البخاری، كتاب النكاح باب عرض المراة نفسها على الرجل الصالح، رقم الحدث: 5121، وصحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن وخاتم حديد وغير ذلك، رقم الحدث: 1425

الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللاَّتِي فِي حُجُورِكُم مِّن نِّسَآئِكُمُ اللاَّتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ فَإِن لَّمْ تَكُونُواْ دَخَلْتُم بِهِنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلاَئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلاَبِكُمْ وَأَن تَجْمَعُواْ بَيْنَ الأُخْتَيْنِ إِلاَّ مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً ﴾[1]

"حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، بھائی کی بیٹیاں، بہن کی بیٹیاں، تمہاری رضاعی مائیں، رضاعی بہنیں، تمہاری ساس، تمہاری پرورش کردہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہوں تمہاری ان بیویوں سے جن سے تم ہمبستری کر چکے ہو[2] ہاں اگر تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے سگے بیٹوں کی بیویاں اور تمہارا دو بہنوں کو جمع کرنا، ہاں جو گزر چکا سو گزر چکا، یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس آیت کریمہ میں جن محرم عورتوں کا تذکرہ ہے ان میں سات (7) محرمات نسبی، سات (7) رضاعی اور چار (4) سسرالی ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1. نسبی محرمات: ماں (دادی اور نانی اوپر تک)، بیٹی (پوتی اور نواسی نیچے تک)، بہن (حقیقی ہو یا سوتیلی) پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی شامل ہیں۔
2. رضاعی محرمات: رضاعی ماں، رضاعی بیٹی، رضاعی بہن، رضاعی پھوپھی، رضاعی خالہ، رضاعی بھتیجی اور رضاعی بھانجی۔
3. سسرالی محرمات: ساس، ربائب (مدخولہ بیوی کی سابقہ خاوند سے لڑکی) بہو اور دو سگی بہنیں۔

ان کے ساتھ باپ کی منکوحہ بھی شامل ہے جیسا کہ سابقہ آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلاَ تَنكِحُواْ مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاء ﴾[3]

"اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا۔"

---

[1]- النساء 4: 23

[2]- بیوی کی پہلے خاوند سے لڑکیاں، جو اب اس کی پرورش میں ہیں۔

[3]- النساء 4: 22

اس کے علاوہ جب تک عورت عقد نکاح میں ہو اس عورت کی پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی سے بھی نکاح حرام ہے۔ حدیث مبارک ہے:

"لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا"[1]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی کسی عورت اور اس کی پھوپھی کو اور اسی طرح کسی عورت اور اس کی خالہ کو (اپنے نکاح میں) جمع نہ کرے۔"

ان محرمات کے علاوہ سب عورتوں سے شادی کرنا صحیح ہے جیسا کہ محرمات کے تذکرہ کے بعد ارشاد ربانی ہے:

﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاء ذَلِكُمْ أَن تَبْتَغُواْ بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ﴾[2]

"اور ان عورتوں کے علاوہ اور عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں کہ اپنے مال سے (مہر ادا کر کے) تم ان سے نکاح کرنا چاہو، برے کام سے بچنے کے لیے نہ کہ شہوت رانی کے لیے۔"

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بعض محرمات جن سے شادی کرنا جائز تھا لیکن کسی اور سبب کی بناء پر حرام ہو گئیں، ایسی ہی عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

I. وہ عورتیں جو بالاتفاق حرام ہیں۔

II. وہ عورتیں جن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پہلی قسم میں وہ عورتیں شامل ہیں جو حلال تھیں لیکن کسی سبب کے پائے جانے کی بناء پر حرام قرار دی گئیں۔ عمومی طور پر یہ انتہائی قریبی رشتہ دار ہوتی ہیں جیسا کہ دو بہنوں کو ایک نکاح میں اکٹھا کرنا۔ اسی طرح کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا اس کی خالہ کو جمع کرنا، اور بھتیجی اور بھانجی ضمنی طور پر اس میں شامل ہیں، کیونکہ پھوپھی کے اعتبار سے دوسری عورت بھتیجی۔ اور خالہ کے اعتبار سے بھانجی، ایسی عورتیں بالاتفاق حدیث نبوی سے حرام ہیں۔ اسی طرح مجازی طور پر اس حکم میں باپ دادا، ماں نانی کی پھوپھیاں خالائیں اوپر تک، اسی طرح پوتیاں نواسیاں

---

[1]۔ صحیح البخاری، کتاب النکاح باب لا تنکح المراۃ علی عمتھا، رقم الحدیث: 5109، وصحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الجمع بین المراۃ وعمتھا او خالتھا فی النکاح، رقم الحدیث: 1408

[2]۔ النساء4: 24

نیچے تک شامل ہیں، امام نووی شرح مسلم میں یہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس میں سب مذاہب کے علماء کے لیے اس بات کی دلیل ہے کہ پھوپھی اور خالہ خواہ حقیقی ہو یا مجازی سب اس میں شامل ہیں [1]۔

اور دوسری قسم میں ایسی عورتیں شامل ہیں جن سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن بعض فقہاء اور موجودہ دور کے بعض اطباء اور مفکرین کہتے ہیں کہ جس حکمت کی بناء پر سابقہ عورتیں حرام ہوئیں یعنی دوسری بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہ وہی حکمت چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد میں پائی جاتی ہے، یعنی دو مختلف چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں یا خالاؤں کی بیٹیوں کو بھی جمع کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح وہ عورتیں جن میں ایک سے زیادہ واسطہ سے رشتہ ہو جیسے چچا یا پھوپھی کی پوتی یا نواسی، اور ماں یا باپ کی طرف سے ایک ہی دادا کی اولاد ہوں، تو ایسی رشتہ دار عورتوں سے شادی کرنا اکثر فقہاء کے ہاں جائز ہے جبکہ دوسرا گروہ اسے ناجائز گردانتا ہے۔ ان کی نظر میں پہلی قسم کی عورتوں سے جس حکمت کی وجہ سے نکاح منع کیا گیا ہے کہ اس سے قطع رحمی لازم آتی ہے اور دو سوکن عورتوں کے درمیان جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں جیسے حسد وبغض اور سب وشتم وغیرہ [2] تو وہی قباحتیں ان دوسری قسم کی عورتوں سے شادی کرنے میں لازم آتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سلف صالحین میں بھی تھا، امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: اس رائے کو اسحاق بن طلحہ، عکرمہ، قتادہ، اور عطاء نے اختیار کیا ہے اور ایک روایت ابو نجیح کی بھی ہے [3]۔ جبکہ ان کے علاوہ اکثر علماء کے نزدیک انہیں جمع کرنا جائز ہے اور یہی بات راجح ہے بلکہ حسن بن حسین بن علی نے ایک ہی رات میں اپنے چچاؤں محمد بن علی اور عمر بن علی کی دو بیٹیوں سے نکاح کیا تھا [4]۔

ابن المنذر کہتے ہیں: میں کسی کو نہیں جانتا کہ جس نے ایسے نکاح کو باطل گردانا ہو۔ یہ ان نکاح کی قسموں میں سے ہے جو مباح اور جائز ہیں کیونکہ اس کی ممانعت میں نہ تو قرآن وحدیث سے کوئی دلیل ہے اور نہ ہی اجماع

---

[1]۔ نووی، شرح مسلم 190:9

[2]۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 4116 میں ہے: اگر تم ایسا کروگے تو تم لازماً قطع رحمی کا سبب بنوگے

[3]۔ اسی رائے کی طرف ابن عبد البر القرطبی شارح موطا امام مالک بھی مائل ہیں، اور کہتے ہیں: ان دونوں میں علت موافق ہے کہ اس سے قطع رحمی لازم آتی ہے، دیکھیے: ابن عبد البر، الاستذکار: 453:5

[4]۔ مصنف عبد الرزاق، رقم الحدیث: 10770

سے۔[1]

امام مالک اس کو مکروہ گردانتے ہیں مگر حرام نہیں جیسا کہ ان کے شاگرد ابن القاسم کہتے ہیں: امام مالک سے پوچھا گیا دو چچازاد بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: میں اسے حرام نہیں جانتا۔ تو کہا گیا: آپ اسے مکروہ سمجھتے ہیں؟ تو فرمایا: لوگ اس سے پرہیز کرتے تھے، جبکہ ابن القاسم خود اسے حلال گمان کرتے تھے۔[2]

اور ابن رشد مالکی کہتے ہیں: سلف صالحین میں حدیث "لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا" کے مفہوم میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ مخصوص الفاظ سے معین مفہوم ہی مراد ہے یا ان مخصوص الفاظ سے عام قاعدہ بیان کرنا مقصود ہے، جمہور فقہاء نے پہلی قسم کو ترجیح دی ہے یعنی جو حدیث کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ اور رشتہ دار عورتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ جبکہ بعض فقہاء کہتے ہیں اس سے مراد ہر دو رشتہ دار عورتوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا ناجائز ہے خواہ وہ محرمات سے ہوں یا نہ ہوں، پس دوسری قسم کی عورتوں سے بھی شادی کرنا جائز نہیں[3]۔

اور اسی رائے کو بعض معاصر مفکرین واطباء پروان چڑھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ ان فقہاء کی اس رائے کے ساتھ عدم جواز پر کچھ طبی اور شماریاتی تحقیق کے دلائل بھی دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رشتہ دار محرم ہو یا نہ ہو ان سے شادی کرنے سے اخلاقی قباحتوں کے ساتھ اولاد کمزور، مضمحل اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن وحدیث سے منصوص محرمات میں کوئی اختلاف نہیں، اور اختلاف صرف ان رشتہ دار خواتین میں ہے جو ان پر قیاس کرتے ہوئے محرمات گردانی جاتی ہیں، جیسا کہ چچازاد (Cousins) وغیرہ۔ جمہور فقہاء ان کو نکاح میں جمع کرنے کو جائز ومباح مانتے ہیں جبکہ کچھ فقہاء اسے ناجائز یا مکروہ کہتے ہیں، آئندہ سطور میں ان دونوں گروہوں کے دلائل کو ذکر کرتے ہوئے راجح کو مرجوح سے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

---

[1]۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر قرطبی، 2:126، 127

[2]- ابن رشد قرطبی ، البیان والتحصیل، 4:287

3- ابن رشد ، بداية المجتهد ، 2:41

پہلے جمہور فقہاء کے دلائل ذکر کیے جاتے ہیں جو ایسی رشتہ دار خواتین سے نکاح یعنی کزن میرج کو جائز ومباح کہتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ﴾[1]۔

اے نبی! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں تو مہر دے چکا ہے، اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ تعالی نے غنیمت میں تجھے دی ہیں، اور تیرے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے۔

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر کزن خواتین کو نبی اکرم ﷺ کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اگر سیرت نبوی ﷺ پر نظر ڈالیں تو آپ ﷺ کی عملی زندگی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امہات المؤمنین میں غالباً ایسی ہی رشتہ دار خواتین ہیں جن سے آپ ﷺ نے شادی کی ہے جیسا کہ آئندہ سطور میں ذکر آرہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا خود ایسی رشتہ دار خواتین سے نکاح کرنا

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو کہ نبی اکرم ﷺ کی پھوپھی امیہ کی بیٹی ہیں، جن کا پہلے نکاح زید بن حارثہ سے ہوا تھا پھر ان کے طلاق دینے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سنہ تین یا پانچ ہجری میں ان سے شادی کر لی تھی۔[2]

ان کے علاوہ کئی ایک ازواج مطہرات کا سلسلۂ نسب آپ ﷺ کے اجداد میں سے کسی جد امجد سے جا ملتا تھا۔ آپ ﷺ کا سلسلۂ نسب یوں ہے: محمد (ﷺ) بن عبد اللہ بن عبد المطلب (نام: شیبہ) بن ہاشم (نام: عمرو) بن عبد مناف (نام: المغیرۃ) بن قصیّ (نام: زید) بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لویّ بن غالب بن فہر ابن مالک بن

---

[1]- الاحزاب 33 : 50

[2]- الاصابة فی تمییز الصحابة از حافظ ابن حجر : 153:8

النضر۔ (1)

ذیل میں ہم ان امہات المؤمنین کا مختصر طور پر تذکرہ کرتے ہیں:

- حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جن کا نام رملۃ تھا، وہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جد امجد عبد مناف سے جاملتا ہے، ان کی پہلی شادی عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ وہ ہجرت حبشہ کے دوران فوت ہوئے تو وہیں بادشاہِ حبشہ نجاشی کے سامنے آپ کا نکاح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں) ہوا۔ (2)
- حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا جن کا سلسلۂ نسب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جد امجد قصی بن کلاب سے جا ملتا ہے۔ ان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے شادی کی تھی۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ (3)
- حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما جن کا سلسلۂ نسب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جد امجد مرۃ بن کعب سے جاملتا ہے۔ اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب ازواج مطہرات سے زیادہ محبوب تھیں۔ یہ نبوت کے چار یا پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور نو سال کی تھیں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی ہو گئی۔ اور ابھی اٹھارہ سال کی تھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئے۔ (4)
- حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا جن کا سلسلۂ نسب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جد امجد کعب بن لویّ سے جاملتا ہے، ان کی پہلی شادی خنیس بن حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی جو بدری صحابی تھے غزوۂ احد کے بعد ان کی وفات ہو گئی تو ان کی عدت پوری ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان سے شادی کی پیشکش کی لیکن انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان میں رغبت دیکھتے ہوئے انکار کر دیا، پس حضرت عائشہ سے شادی کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے تین سال بعد ان سے شادی کی۔ پھر

---

[1]۔ سیرت ابن هشام : 1:1

[2]۔ حافظ ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة،140:8

[3]۔ ایضاً، 99:8

[4]۔ ایضاً ، 232:8

ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں ایک طلاق دی تو جبریل امین آئے اور فرمایا: آپ رجوع کر لیں کیونکہ وہ بہت زیادہ روزے رکھنے اور قیام کرنے والی ہے اور یہ آپ کی جنت میں بھی بیوی ہوں گی۔ (1)

- حضرت سودہ بنت زمعہ القرشیہ العامریہ رضی اللہ عنہا جن کا سلسلۂ نسب آپ ﷺ سے آپ کے جد امجد لویّ بن غالب سے جا ملتا ہے۔ ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا۔ اس کی وفات کے بعد نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں آئیں اور یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد پہلی خاتون ہیں جن سے آپ ﷺ نے شادی کی۔ اور ایک دفعہ آپ ﷺ نے انہیں طلاق دینا چاہی تو انہوں نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں میں اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیتی ہوں (2)۔

اسی طرح نبی مکرم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالی نے چار بیٹیاں عطا کیں۔ آپ ﷺ نے ان کے نکاح بھی ایسے لوگوں سے کیے جن سے قریبی رشتہ داری یا جن کا حسب ونسب آپ ﷺ کے آباء واجداد میں سے کسی جد امجد سے جا ملتا تھا۔ ان چاروں پاکیزہ بیٹیوں کے نکاحوں کی کچھ تفصیل یہ ہے:

- حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا (3)، یہ آپ ﷺ کی سب سے چھوٹی اور محبوب بیٹی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی پیدائش نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے چند سال پہلے ہوئی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہا کی شادی ہجرت کے دوسرے سال اپنے چچیرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حطمی درع کے حق مہر پر کر دی تھی، جن سے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ (4)
- حضرت زینب رضی اللہ عنہا یہ آپ ﷺ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں جن کی پیدائش بعثت نبوی ﷺ سے تقریبا دس سال پہلے ہوئی تھی، اور ان کی شادی نبی اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے (آپ رضی اللہ عنہا کے خالہ زاد بھائی) حضرت ابو العاص بن الربیع رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ میں کی تھی جن کی والدہ کا نام ہالہ بنت خویلد تھا۔ حضرت بو العاص رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب نبی اکرم ﷺ سے ان کے جد امجد عبد

---

[1]۔ حافظ ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة، 86:8

[2]۔ ایضاً، 196:8، و صحیح مسلم، کتاب الرضاع باب جواز هبتها نوبتها لضرتها، رقم الحدیث:1463

[3]۔ ان کا تذکرہ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قریبی رشتے داری کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

[4]۔ الاصابة فی تمییز الصحابة از حافظ ابن حجر، 8:262

مناف سے جاملتا ہے۔

حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ ہجرت کے چھٹے سال قیدی ہو کر مدینہ منورہ آئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا اور اس سے اگلے سال انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو ان کے پاس بھجوا دیا تھا[1]۔

- حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹیاں، جن کی شادی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کے بعد دوسری کی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کی تھی۔ ان کا سلسلۂ نسب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جد امجد عبد مناف ابن قصیّ سے جاملتا ہے۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی ان سے شادی مکہ مکرمہ میں ہوئی اور انہوں نے ہجرت حبشہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا، اسی وجہ سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ذوالنورین کے لقب سے مشہور ہوئے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں تھیں[2]۔

ایسی بے شمار قطعی الدلالہ نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خیر القرون نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسے رشتے داروں کی آپس کی شادی بیاہ عام تھا بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ذاتی عمل بھی اسی امر کی گواہی دیتا ہے۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ذکر کیا جاتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں اور نواسے نواسیوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے بعد سلف صالحین کا اسی پر عمل تھا، بلکہ تاریخ اسلام ایسی شادیوں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے جبکہ ان بیماریوں یا ان کے علاوہ دوسرے امراض کا اشارتاً بھی کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

ویسے بھی اگر ایسے نکاح میں کوئی ممانعت یا کسی قسم کا کوئی ضرر ہوتا تو اللہ تعالی جو رؤف، رحیم اور حکیم ہیں کبھی بھی اپنے پیارے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ چیز جائز ہی نہ کرتے اور نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنی ذات اور بیٹیوں کے لیے پسند فرماتے، اور یہی چیز اس کے جائز و مباح ہونے کے لیے کافی ہے۔

اور ابن حزم الظاہری کہتے ہیں: ہم اپنے مباح رشتہ داروں کی آپس کی شادیوں کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ اس پر

---

[1]۔ حافظ ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة، 151:8

[2]۔ ایضًا، 138:8 اور 460

رسول اللہ ﷺ نے خود عمل کیا بلکہ اپنی تمام بیٹیوں کی شادیاں بھی بنو ہاشم اور بنو شمس میں کیں۔ اور اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[1]

"یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ (کی زندگی) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔[2]"

دوسرے گروہ کا موقف

اب دوسرے گروہ کے نقلی اور عقلی دلائل کا مختصر طور پر جائزہ لیا جاتا ہے جو رشتہ داروں میں نکاح کو جائز نہیں سمجھتے۔ ان کے نقلی دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

1. "نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ عَلَى قَرَابَتِهَا مَخَافَةَ الْقَطِيعَةِ."

"رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو رشتہ دار سے نکاح کرنے سے روکا کہ بعد میں قطع رحمی کا سبب بنے۔" [3]

ابو داود نے اسے اپنی کتاب "المراسیل" میں روایت کیا ہے اور یہ حدیث مرسل ہونے کی بناء پر ضعیف ہے اگرچہ اس کے تمام راوی ثقات ہیں۔

2. حدیث "اغتربوا ولا تُضوُوا" ایک روایت میں ہے "أغربِوا ولا تُضوُوا" اجنبی عورتوں سے شادی کرو تاکہ اولاد اپاہج وکمزور نہ پیدا ہو۔[4]

صحیح یہ ہے کہ ایسی کوئی حدیث نہیں ہے اسے سب سے پہلے ابراہیم حربی نے اپنی کتاب غریب الحدیث میں صیغۂ تمریض کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس کی کوئی سند بھی ذکر نہیں کی۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے ہاں کوئی محاورہ بولا جاتا تھا جسے انہوں نے کسی معنی کی دلالت کے لیے استعمال کیا اور کسی وجہ سے اس کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کر دی۔ اسی لیے ابن الملقن کہتے ہیں: میں نے اس موضوع کے بارے میں کسی حدیث کی

---

[1]- الاحزاب33: 21

[2]- المحلی از ابن حزم الظاہری، 209:11

[3]- المراسیل از ابی داود ، 208

[4]- غریب الحدیث از ابراہیم الحربی، 378:2

کتاب میں کوئی ایسی روایت نہیں پائی جو معناً اس کے قریب ہو۔[1]

3. اور حدیث "لا تنكحوا القرابة القريبة فإن الولد يخلق ضاوياً" "کہ قریبی رشتہ داروں کی آپس کے نکاح نہ کرو کیونکہ اس سے اولاد کمزور واپاہج پیدا ہوتی ہے۔"

یہ بھی صیغۂ تمریض کے ساتھ مروی ہے، اسے سب سے پہلے ابن سیدہ نے اپنی کتاب المحکم والمحیط الاعظم میں صیغہ مجہول سے روایت کیا ہے اور امام غزالی نے اسے احیاء علوم الدین میں جگہ دی ہے، حافظ عراقی احیاء العلوم کی تحقیق میں کہتے ہیں: ابن الصلاح نے کہا ہے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے[2]۔

4. اور حدیث «النَّاكِحُ فِي قَوْمِه كَالْمُعَشِّبِ فِي دَارِه» کہ اپنے خاندان میں شادی کرنے والا گھر میں گھاس پھوس کی طرح ہوتا ہے، اسے ابن عدی نے اپنی کتاب الکامل میں اور طبرانی نے المعجم الاوسط میں روایت کیا ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے اس کی سند میں سلیمان بن ایوب ضعیف اور منفرد راوی ہے جس کی کوئی متابعت نہیں کرتا، اور طبرانی کی روایت کے بارے میں حافظ الہیثمی کہتے ہیں اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں[3]۔

5. اور قول عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہ انہوں نے آل السائب کو فرمایا: تم صحت کے لحاظ سے کمزور ہو چکے پس اجنبی عورتوں سے نکاح کرو۔

حافظ ابن حجر نے اسے تلخیص الحبیر میں ذکر کیا ہے کہ اسے ابراہیم حربی نے اپنی کتاب غریب الحدیث میں عبد اللہ بن المؤمل سے انہوں نے ابن ابی ملیکۃ سے روایت کیا ہے، لیکن اس میں دو علتیں ہیں: عبد اللہ بن مؤمل ضعیف ہے[4] اور ابراہیم حربی اور عبد اللہ کے درمیان انقطاع ہے۔[5]

اگر غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے نقلی دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں جو ضعیف نہ ہو

---

[1]۔ البدر المنیر از ابن الملقن، 500:7

[2]۔ المحکم والمحیط الاعظم از ابن سیدہ، 907:5، احیاء علوم الدین از غزالی، 971:2

[3]۔ الکامل فی ضعفاء الرجال ازابن عدی، 284:4، المعجم الاوسط از الطبرانی: 206، مجمع الزوائد از حافظ الهیثمی 7354

[4]۔ تقریب التہذیب از ابن حجر، 3649.

[5]– یہ روایت حربی کی کتاب غریب الحدیث میں نہیں ملی جبکہ ابن حجر نے اسے تلخیص الحبیر، 309:3 میں ذکر کیا ہے

اور اب ان کے عقلی دلائل کو مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. بے شک سروے، شماریاتی ریسرچز اور سائنسی طبی تجربے یہ ثابت کرتے ہیں کہ موروثی بیماریوں کے انتشار و پھیلاؤ کا سبب رشتے داروں کی آپس میں کی گئی شادیاں خصوصاً کزن میرج ہیں یعنی یہ بیماریاں ماں باپ سے اولاد میں منتقل ہوتی ہیں۔ اور یوں وہ ان امراض کے پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔[1]

عصر حاضر کے طبی ماہرین کہتے ہیں کہ جدید طب کی تشخیص یہ ہے کہ وہ امراض جن کے پھیلنے کا سبب رشتہ داروں کی شادیاں ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے اہم کچھ یوں ہیں:

- تھیلسیمیا (Thalassemia) جو انسانی خون میں سرخ خلیوں پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے جسم کا دفاعی نظام متاثر ہو جاتا ہے، بعض دفعہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے خون میں جالا بن جاتا ہے اور یہ بھی خون کی کمی کا سبب بنتا ہے۔
- عقلی پسماندگی (نقص عقلی) اس کی وجہ سے عام انسانی عقل (سمجھ بوجھ) متاثر ہوتی ہے، یا تو مکمل طور پر معدوم ہوتی ہے، یا ہوتی تو ہے لیکن آدمی ہم عصر ساتھیوں سے عقل میں پیچھے رہ جاتا ہے، یا پھر اس میں کسی اور طرح کا نقص واقع ہو جاتا ہے۔
- جگر کے امراض کا سبب بنتا ہے جیسے جگر کا کام چھوڑ دینا اور بعض دفعہ انسانی اعصاب کو تلف کر دیتا ہے۔
- انسانی جلد میں سفید داغ بننے کا سبب بن جاتا ہے، جسے Albinism کہا جاتا ہے۔
- خون انسانی میں فولاد کی زیادتی کا سبب بن جاتا ہے۔
- انسان کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں نقص یا ٹیڑھ پن واضح ہوتا ہے۔
- مرض Phenylketonuria لاحق ہوتا ہے جس سے ذہنی پسماندگی، قد نہ بڑھنا وغیرہ بیماریاں لگ جاتی ہیں۔
- مرض Alkaptonuria بھی لاحق ہونے کا خدشہ ہوتا ہے، جو جوڑوں اور دل پر اثر کرتا ہے
- مرض Polycystic kidney ایسی بیماری ہے جو گردوں کو یا تو فیل کر دیتی ہے یا متاثر کرتی ہے۔
- مرگی، عضلات کی بے ترتیبی، الرجی، شوگر وغیرہ کا بھی سبب بننے کا خدشہ ہوتا ہے۔

---

[1]۔ زواج الاقارب وعلاقته بالامراض الوراثية، ملخص، ص: 236 للطالبة/ نجاة ناصر، رسالة ماجستير بجامعة ابی بكر بتلمسان، الجزائر

اس کے علاوہ بھی کئی ایک بیماریوں کے لاحق ہونے کا خدشہ رہتا ہے[1]۔

اس گروہ کے نظریے کے مطابق اولاد میں مذکورہ بالا بیماریوں کے ہونے کا سب سے بڑا سبب رشتہ داروں کی آپس کے شادی بیاہ خصوصاً کزن میرج ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ان کے ان لوگوں کے اخذ کردہ نتائج خیالی امور پر مبنی ہیں نہ کہ حقائق پر، بلکہ حقائق اس کے برعکس ہیں:

1. قرآن وحدیث کی واضح نصوص ان کے اس نظریے کے برعکس ہیں۔
2. انہوں نے جن نقلی دلائل کا سہارہ لیا ہے وہ ضعیف ہیں۔
3. عقلی دلائل ان کے محدود علم وتجربات پر مبنی ہیں، یا پھر مخصوص حالات یعنی کہ مکان اور زمان کے اعتبار سے مانے جاسکتے ہیں لیکن علی الاطلاق یہ حکم صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر کوئی بیماری کسی جگہ یا خاص وقت میں عام ہے تو رشتہ داروں اور اجنبیوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ماحول اور موسم کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔
4. یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ اجنبیوں میں شادی کرنے سے یہ بیماریاں لاحق نہیں ہوں گی، بلکہ ممکن ہے کہ اجنبی مرد یا عورت کچھ نئی بیماریوں کا سبب بن جائے۔ اگر کوئی مرد اجنبی عورت سے شادی کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ موروثی بیماریاں ایک دوسرے میں منتقل ہوجائیں۔
5. ویسے بھی بعض اطباء نے علی الاطلاق اس کے مؤثر ہونے کی نفی کی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر الکباریتی جو کہ کویت سے تعلق رکھتے ہیں وہ ایک ندوہ میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> "یہ اعتقاد ہی غلط ہے کیونکہ یہ علمی طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ ایسا معاشرہ جس میں عموماً شادی بیاہ رشتے داروں میں ہوتا ہے، دوسرا وہ معاشرہ جس میں اجنبیوں میں اکثر شادی کی جاتی ہے، تیسرا وہ معاشرہ جس میں متفرق لوگوں میں شادی کی جاتی ہے، ان سب میں امراض کے پھیلنے میں کوئی نمایاں فرق نہیں پایا گیا۔"

---

[1]۔ زواج الاقارب وتاثیرہ علی صحة المولود، ملخص، ص:21، دراسه میدانیة للأطفال/عزیز بوقفه، بجامعة قاصدی مرباح

پھر انہوں نے ایک وراثت کے ماہر کا ذکر کیا کہ ان کے سروے کے نتائج اسی چیز کی تصدیق کرتے ہیں کہ بعض امراض موروثی طور پر لاحق ہو جاتے ہیں جبکہ بعض اوقات وہ مؤثر نہیں ہوتے[1]۔"

"اسی طرح ڈاکٹر احمد شوقی ابراہیم جو کہ الصباح ہسپتال کویت میں ماہر باطنی امراض ہیں وہ ہر دو پہلو پر تفصیلی بحث کرتے ہیں اور موروثی امراض کو مخصوص حالات کے ساتھ جوڑتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ نظریہ علی الاطلاق تسلیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ کبھی کبھار ہونے کا امکان ہے اور بعض مخصوص حالات میں ایسا ہونا صحیح ہے لیکن اسے کلیتاً تمام حالات سے جوڑنا صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ اسے عمومی قاعدۃ کلیۃ یا قانون سمجھنا بعید از قیاس ہے۔"

مزید کہتے ہیں: "موروثی بیماریوں کا اولاد میں زیادہ نسبت سے ظاہر ہونا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ اس کے والدین کی وجہ سے ہے اور یہ آپس کے نکاح کا نتیجہ ہے۔ بہر حال یہ کوئی معتمد قاعدۃ نہیں ہے۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یہی اولاد میں بیماریوں کا سبب ہے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اجنبی عورتوں سے نکاح کے ساتھ اولاد صحت مند پیدا ہو گی۔"

جبکہ ڈاکٹر محمد علی البار کہتے ہیں: لوگوں میں یہ وہم ڈالنا کہ رشتہ داروں کی آپس کی شادی ہی موروثی امراض کے پھیلنے کا سبب ہے، یہ مطلقاً صحیح نہیں ہے[2]۔

بہر حال مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسی آراء و نظریات سے بچیں جن کا تعلق اور اعتماد محض عقلی یا خیالی مفروضوں پر مبنی ہے جن کی بنیاد محدود علم اور علاقہ یا معین مکان وزمان سے ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کے نظریات بظاہر قرآن وحدیث کی صریح نصوص کے خلاف نظر آتے ہیں۔

اور جب ایسی صورتحال ہو کہ شرعی دلائل اور انسانی طے کردہ نتائج میں بظاہر ٹکراؤ نظر آرہا ہو تو شریعت ہی مقدم ہو گی کیونکہ عقل وہی معتبر ہے جو اسلامی تعلیمات کے تابع ہو گی۔ مزید یہ کہ اس بارے میں سیرت النبی ﷺ ہمارے لیے صحیح منہج حیات طے کرنے میں ممد ومعاون ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی

---

[1]۔ ملخص الندوة صحيفة القبس الكويتية فی عددها الصادر فی 25 ديسمبر سن 1977م.

[2]۔ زواج الاقارب بين الفقه والطب للدكتور احمد بن عبد العزيز الحداد، ص: 7، ادارة الافتاء بدبی، الامارات العربية المتحدة

ہمارے لیے مشعل راہ اور بہترین اسوۂ حسنہ ہے۔

حاصلِ بحث

ہم نے اس مختصر بحث میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں رشتہ داروں کی آپس میں شادی خصوصاً کزن میرج پر کوئی قدغن و حرج نہیں بلکہ ایسا کرنا صحیح و مباح ہے۔ اور جو لوگ اس پر اعتراضات اٹھا رہے ہیں اور دلائل دے رہے ہیں وہ شرعی حقائق اور فیلڈ ریسرچ حقائق سے موافقت نہیں کرتے۔

سیرت النبی ﷺ میں دوسرے امور کی طرح اس مسئلے پر بھی سیر حاصل مواد موجود ہے اور اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اس پر اپنا عمل بھی موجود ہے بلکہ آپ ﷺ نے اپنی تمام بیٹیوں کی شادیاں بھی اپنے رشتہ داروں میں کی تھیں۔ اور مزید یہ کہ اللہ تبارک وتعالی نے اپنے محبوب کے لیے ایسے رشتہ داروں کے ساتھ شادی کے جواز و حلت پر قرآن کی آیت نازل کی ہے۔

اور ایسے رشتہ داروں کے ساتھ نکاح کی صحت و اباحت پر قرآن وحدیث سے بے شمار دیگر دلائل موجود ہیں جبکہ اس کے بالمقابل عدم جواز پر کوئی ایسی نص نہیں پائی گئی جو معتبر اور قابل حجت ہو، اور تجرباتی و شماریاتی تحقیق سے جو تصوراتی نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ مخصوص زمانی و مکانی اعتبار سے تو ممکن ہو سکتے ہیں، کل وقتی یا کلی طور پر اسکا اطلاق صحیح نہیں ہے، جبکہ کئی ایک ایسی علمی و شماریاتی تحقیقات موجود ہیں جن کے نتائج اس کے غیر مضر ہونے اور مذکورہ بالا موروثی بیماریوں کے عدم پھیلاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سفارشات

سیرت النبی ﷺ کے عام و خاص تمام پہلوؤں کو مختلف انداز میں اجاگر کرنا چاہیے تاکہ عام لوگ بھی اس سے اپنی زندگی کے مختلف امور میں استفادہ کر سکیں۔

میڈیا، خصوصاً سوشل میڈیا کے غلط استعمال پر پابندی ہونی چاہیے۔ اگر ان کا استعمال ناگزیر ہو تو ہر مسئلے کی تحقیق کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ بلکہ ایسے پروگرام ترتیب دینے چاہییں جن میں ان کے صحیح و غلط استعمال کی طرف رہنمائی ہو۔

عام لوگوں اور بچوں کی تربیت صحیح نہج پر ہونی چاہیے کہ وہ بیان کی گئی یا سنی سنائی باتوں سے متاثر نہ ہوں۔ اس میں علماء کرام اور اساتذہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مستند حقائق اور مفروضوں پر مبنی تاویلات کی نشاندہی کی جانی چاہیے تاکہ عام لوگوں کے لیے صحیح منہج اختیار کرنے میں آسانی ہو اور وہ غلط روش سے بچ سکیں۔

انتہا پسندی کے اسباب اور علاج

سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں

حافظ صدام حسین حسنیؔ*

ABSTRACT

Islam is religion of peace and it teaches to be moderate. Islam offers detailed golden rules for leading a life which enables mankind to establish its individual and collective life on moderate and stable bases. Extremism has no connection with any religion; it is a behavior which may develop in any person regardless of cast, creed and color. Islam condemns every ideology that nurtures extremist thoughts against any political or religious group. Extremism paves the way of violence, anarchy and terrorism. This world would never be an ideal place for mankind until and unless extremism is rooted out completely. There are many reasons behind extremism which include injustice, malice, poverty and unemployment, ego, western tyranny, desecration of Islamic values and ignorance. For exterminating extremism, it is mandatory to establish a society by following the life of Prophet (SAW) as a model. An exemplary society which broadens the individual way of thinking, propagates moderation, teaches to love each other and gives a kinesthetic approach for the respect of humanity. A practical demonstration of inter-sectarian and inter- religious harmony is ardently required. Differences like religious and sectarian, political and social, financial and civic have to be resolved through an enduring and moderate way. A culture of

* لیکچرر، یونیورسٹی کالج آف ڈیرہ مراد جمالی نصیر آباد، بلوچستان

patience, forgiveness, brotherhood, and equality has to be adopted that may help eradicating violence, animosity, inequality, extremism, and terrorism from our society.

Keywords: اعتدال، شعائر اسلام، تکریم انسانیت، بین المذاہب رواداری، مغربی جارحیت

"انتہا پسندی" کا لغوی معنی

لفظ "انتہا" کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے صاحب فیروز اللغات نے لکھا ہے:

انتہا کسی کام کا آخری سرا، انجام اور خاتمہ ہے۔[1]

وارث سرہندی بیان کرتے ہیں:

انتہا پسند سے مراد اخیر پسند، غیر اعتدال پسند، نہایت پسند، غیر معتدل۔[2]

انتہا پسندی کا اصطلاحی مفہوم

سید سلمان ندویؒ انتہا پسندی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انتہا پسندی سے مراد یہ ہے کہ کسی نقطۂ نظر یا نظریہ کی ایسی طرفداری کی جائے اور ایسی عصبیت برتی جائے کہ دوسروں کی آراء کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔"[3]

جدید اردو لغت میں انتہا پسندی کی اصطلاح کو اعتدال کے بالمقابل استعمال کیا گیا ہے۔[4]

چنانچہ مندرجہ بالا معانی کی روشنی میں انتہا پسندی سے مراد امور سے متعلق معاملات میں بے اعتدالی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔

انتہا پسندی کو انگریزی میں "Extremism" کہتے ہیں جو کہ انگریزی لفظ "Extreme" سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے:

---

[1]: فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز لاہور، 2005ء، ص:126

[2]: وارث سرہندی، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ لاہور، 1986ء، ص:148

[3]: سلمان ندوی، اسلامی بیداری انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، 1992ء ص:35

[4]: جدید اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اشرف ندیم پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس اسلام آباد، ص:213

"A feeling, a situation, way of behaving, etc. whale is different as possible from another or is opposite to it: extreme love and hate." (1)

"ایک احساس، صورتِ حال، رویہ، وغیرہ جو دوسرے سے ممکنہ حد تک مختلف ہو یا اس سے مخالف ہو۔ (جیسے) شدید محبت اور (شدید) نفرت۔"

اور انتہاپسند سے مراد ہے:

"A person whose opinions, especially about religion or politics, are extreme , and who may do things that are violent, illegal, etc.''(2)

"وہ شخص جس کے خیالات، خاص طور پر مذہب اور سیاست کے بارے میں شدید ہوں اور وہ جو کام کرے وہ متشددانہ اور غیر قانونی ہو۔"

اس لحاظ سے انتہاپسندی سے مراد ہے:

"The political, can religious ideas or actions that are extreme and not normal, reasonable or acceptable to most people."(3)

"وہ سیاسی، مذہبی وغیرہ نظریات یا افعال جو شدید ہوں اور عام، معقول نہ ہوں یا اکثر افراد کو قبول نہ ہوں۔"

مشہور اسلامی سکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے مطابق:

"Extremism means being situated at the farthest possible point from the center. Figuratively, it indicates a similar remoteness

---

1- Ronald wintrobe, Rational Extremism: The Political Economy of Radicalism, , Cambridge University Press, UK, 2006, p:6

2 -Rational extremism: The political economy of Radicalism, Ronald wintrobe, Cambridge University Press, UK, 2006, p:6

3- www.iboinstitute.org/mod/glossary/view.php.Retrieved ,18-06-2007

in religion, in thought, as well as behavior."[1]

"انتہا پسندی سے مراد (سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی) مرکز سے ممکنہ حد تک دور مقام پر ہونا۔ اصطلاحاً یہ مذہب، نظریات اور طرز عمل سے دوری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔"

انتہا پسندی کے اسباب

1۔ معاشرتی حقوق میں عدم مساوات

معاشرے میں رہتے ہوئے اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے تو وہ انصاف کے مطالبے کا حق رکھتا ہے، اور اس کو انصاف دینا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ اگر معاشرے میں مساوی رویہ نہ رکھا جائے امیر اور طاقتور کو جلد انصاف مل جائے اور غریب کو رد کر دیا جائے، کسی جرم پر کمزور کو فوراً سزا دی جائے اور امیر کے ساتھ نرم رویہ رکھا جائے تو اس کے رد عمل میں کمزور مایوس ہو جائیں گے اور طاقتور ظلم و جبر پر دلیر ہو جائیں گے۔ یہی دوہرا رویہ غریبوں اور کمزوروں میں مایوسی، شدت اور انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس کلچر کے خاتمے کے لیے ارشاد فرمایا:

"يا ايها الناس الا ان ربكم واحد وان اباكم واحد ولا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأحمر على أسود ولا لأسود على أحمر الا بالتقوى" [2]

"اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ (آدم علیہ السلام) ایک ہے۔ کسی عربی کو غیر عرب پر اور کسی غیر عرب کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر اور نہ سیاہ فام کو سفید فام پر فضیلت حاصل ہے، سوائے تقویٰ کے۔"

2۔ ظلم و ناانصافی

کسی بھی معاشرے میں انتہا پسندی کے پنپنے کا اصل سبب ظلم و ناانصافی ہے، جو گروہ مظلوم ہوتا ہے اگر وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کر پاتا اور انصاف کے حصول سے محروم رہتا ہے تو اس میں انتقامی جذبات پرورش پاتے ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ قانونی راستے بند ہیں تو غیر قانونی راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے انتہا پسندی اور دہشت گردی کو

---

[1] :Dr. Yousuf Al-Qaradawi, Islamic awakening between Rejection & Exrtemism, international Institute of Islamic Thought (IIIT) Herndon, VA, USA, p:1,1991

[2] ۔ طبرانی، المعجم الاوسط، 5 : 86، رقم الحدیث : 4749، دار الکتب العلمیہ، 1983

روکنے کا اس سے مؤثر طریقہ نہیں ہے کہ معاشرہ میں ظلم وجور کا دروازہ بند کیا جائے اور عدل وانصاف کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ تاکہ انتہا پسندی پر ابھارنے والے عوامل باقی نہ رہیں۔

3۔ عدم برداشت

تاریخ کے بغور مطالعہ سے دہشت گردی کے اسباب وعلل میں ایک اہم اور بنیادی وجہ جو سامنے آتی ہے وہ ہے عدم برداشت اور تحمل کے جذبات کی کمی، انسان اور حیوان کے درمیان جو بنیادی فرق ہے وہ ہے اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے والا جوہر عقل۔ اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ یہ جوہر انسان کو تحمل اور برداشت سے کام لینا سکھاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انسان سے برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا وہ بے قابو ہو گیا اور اس کا لازمی نتیجہ دہشتگردی ہے کیونکہ جب ایک طرف سے تشدد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو نسل در نسل پروان چڑھتا ہے۔

4۔ غربت وبے روزگاری

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور امن وسکون کے لیے معاشی ترقی ومعاشی استحکام بہت ضروری ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک امن کی فضا قائم نہ ہو۔ غربت، معاشی ناہمواری، بے روزگاری اور ظلم واستحصال جیسے عناصر انتہا پسندی اور دہشتگردی کے فروغ میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے بے روزگاری کے حوالے سے فرمایا:

"كاد الفقر ان يكون كفرا"[1]

"غربت وافلاس انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔"

5۔ سیاسی انتہا پسندی

آج انتہا پسندی کا جیسے ہی نام لیا جاتا ہے تو عام عوام کے ذہنوں میں ہمیشہ مدارس کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی ایک عامل ہے لیکن اس کے علاوہ بہت سارے اسباب، وجوہات اور عوامل کارفرما ہیں جو لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں یا لوگوں کے سامنے ان باریکیوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ معاشرے میں انتہا پسندی کو جنم

---

[1] ۔ بیهقی، احمد بن حسین بن علی، شعب الإیمان، دار الکتب العلمیه، بیروت لبنان، 5: 267، رقم الحدیث: 6612

دینے میں سیاسی پارٹیوں اور سیاسی نمائندوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ نااہل حکمران اپنی نااہلی چھپانے کے لیے یا اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے سادہ لوح نوجوانوں کی برین واشنگ (Brain washing) کی جاتی ہے تاکہ ملک میں خوف وہراس اور انارکی پیدا کی جاسکے۔

سیاسی بصارت سے عاری لوگ اگر سیاست کی بھاگ دوڑ سنبھال لیتے ہیں یا صاحبان اقتدار اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ کے درجہ پر فائز سمجھنے لگتے ہیں تو اپنے اقتدار کی طاقت دکھانے کے لیے عوام پر ظلم وستم، جبر وزیادتی اور ریاستی دہشتگردی شروع کر دیتے ہیں۔ جب مظلوم عوام کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ ہو اور انصاف کی فراوانی نہ ہو تو مظلوم کے پاس بغاوت، شدت، دہشتگردی اور انتہاپسندی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

مغربی انتہاءپسندی

عصر حاضر میں عالمی سطح پر سیاسی حالات نے جو رخ اختیار کیا کہ مسلمان رد عمل کا شکار ہوئے، ایک طرف شعائر دین کی بے حرمتی اور مسلمانان عالم کے ساتھ ظلم وزیادتی، غیر اسلامی افکار ونظریات اور منکرات کا بڑھتا ہوا طوفان ہے جو مغربی جارحیت، نسلی تعصب، مذہبی جنون اور غارت گری کا شکار نصف صدی سے زیادہ عرصے سے صرف اور صرف مسلمان ہی۔، طرفہ تماشا یہ کہ تہذیبی اقدار، احترام انسانیت، بنیادی انسانی حقوق، عالمی امن، انسان دوستی اور عالمی ضمیر کے نام نہاد ترجمان اور اخلاقی اور قانونی قدروں کے نام نہاد امین اس پر نہ صرف خاموش بلکہ ظالموں کے معاون ومددگار اور اس کے وکیل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ آج خود ساختہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کی توپوں کا رخ بھی صرف اور صرف مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلمان اپنے ہی ممالک میں عالمی اور صہیونی جارحیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے میں امن کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے۔

اگر مغربی لوگ سیکولر سوچ کے قائل ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتے لیکن یہ کہاں کا اصول ہے کہ ان کی خواہش کے خلاف کوئی عمل ہو تو انتہاپسندی اور مسلمان عورتوں پر حجاب پر پابندی لگائی جائے تو یہ آزادی! بنت حوا کو عریاں کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنا آزادی ہے اور حجاب اوڑھنا انتہاپسندی ہے! اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ مغربی معاشرے کی سلامتی وترقی میں رکاوٹ ہے۔ مغربی محققین نے ہمیشہ اس طرح کے افعال کو پوشیدہ رکھنے یا انہیں کوئی اور لبادہ پہنا کے دنیا کے

سامنے پیش کیا ہے۔ سویٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں کے خلاف تحریک چلائی گئی، قرآن مجید کو جلانے کے واقعات سامنے آئے، مسلمانوں کے ایمانی جذبوں کو مجروح کرنے کے لیے بار بار نبیٔ کریم ﷺ کی ناموس پر ڈاکے ڈالنے کی کوشش کی گئی کبھی نامناسب الفاظ کی صورت میں تو کبھی توہین آمیز کارٹونوں کی صورت میں۔ اہلِ مغرب مسلمانوں پر انتہاپسندی اور دہشتگردی کے الزامات لگا کر خود کو امن کا علمبردار ثابت کرتے ہیں۔ جیسے ہی ان کا کوئی فرد کسی دہشت گردی کی کاروائی میں ملوث ہوا اسے ذہنی مریض قرار دے کر انفرادی عمل گردانا جاتا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا[1]

اگر انتہاپسندی اپنے آپ کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھنے کا نام ہے تو مغرب سب سے بڑا انتہاپسند ہے کہ وہ اسلحہ کے زور پر اپنے نقطۂ نظر کو نافذ کرنا چاہتا ہے اور دنیا کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے تسلیم کرے۔ مسلمان مغرب سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرے اگر مسلمان اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو مغرب کو اس سے کیا تکلیف ہے؟ اصل وجہ یہ ہے کہ مغرب پوری دنیا کو اپنی تہذیب دینے پر اصرار کر رہا ہے اور جو شخص، گروہ یا ملک ایسا کرنے میں پس و پیش کرتا ہے تو اس پر انتہاپسندی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں گستاخیاں

مغربی ممالک میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں توہین آمیز اور گستاخانہ خاکوں کی اشاعت نے دنیا کو ہیجانی اور اشتعال انگیز صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔

ماضی میں سیکڑوں کی تعداد میں ایسی کتابیں اور اخباری مضامین شائع ہوئے جن میں اسلام کو ہدف تنقید بنایا گیا اور مسلمانوں کے بنیادی عقائد کی تغلیط کی کوشش کی گئی ہے مگر مسلمانوں نے کبھی اس طرح کے علمی بحث مباحثے پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک یہ آزادی اظہار کا تقاضا ہے۔ مبالغہ آمیز اور مضحکہ خیز انداز میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مغربی پریس میں جو کچھ آتا ہے اس پر بھی مسلمانوں نے کبھی تحمل اور برداشت کا

---

[1]: اکبر الہ آبادی

دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسلام کے علماء اور محققین نے ہمیشہ ایسے اعتراضات کا علمی اور تحقیقی جواب دینے پر اکتفا کیا ہے۔ تاہم جب کبھی آزادی اظہار کے حق کا غلط اور بے جا استعمال کیا جاتا ہے اور اسلام کی مقدس ترین ہستیوں کی دیدہ و دانستہ توہین کی جاتی ہے تو پھر اس معاملہ پر بے چینی، اضطراب اور غم وغصے کا پیدا ہونا ایک فطری اور ناقابل فہم امر ہے۔"[1]

آزادی اظہار رائے کے نام پر جہاں مسلمانان عالم کے جذبات و احساسات کو مجروح کیا جارہا ہے، وہاں انتہا پسندوں کو ان کے غیر قانونی اقدامات کے لیے منطقی جواز فراہم کیے جارہا ہے۔

جہالت

انتہا پسندی اور شدت پسندی کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ جہالت ہے۔ جہالت ہی کی وجہ سے لوگ عقائد و اعمال اور اخلاقیات و معاملات میں بگاڑ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عقائد و نظریات میں اگر اختلافات ہوں تو علم والے اسے دلائل اور بات چیت سے حل کرتے ہیں لیکن جاہل کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی لہذا وہ شدت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور بزورِ بازو اپنے نظریات دوسروں سے منوانا چاہتا ہے۔ انہیں اختلافات کی وجہ سے مختلف قسم کے خرافات و تعصبات جنم لیتے ہیں اور لوگ لسانی، قومی، علاقائی اور مذہبی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

عدالتی نظام میں کمزوریاں

آج کل معاشرتی ناہمواری کی ایک وجہ انصاف کی عدم فراہمی بھی ہے۔ عدالتی نظام کو اتنا پیچیدہ بنادیا گیا ہے کہ ایوان عدل کے دروازوں تک عوام الناس کی رسائی مشکل ہو گئی ہے۔ جزا و سزا کے معاملات میں جتنا جلدی ہو سکے فیصلہ کیا جائے تاکہ حق دار کو اس کا حق مل جائے۔ اس مسئلے میں تاخیر کرنا ظلم ہے اور اگر ظلم کا فوری تدارک نہ کیا جائے تو وہ پھلنا پھولنا شروع ہو جاتا ہے، اور بعد میں اس کا خاتمہ مشکل ہو جاتا ہے۔

انتشار و افتراق

شدت پسندی کا ایک سبب اور نتیجہ تفرقہ بازی بھی ہے۔ صدر اول میں تاریخ اسلام میں جو فرقے وجود میں آئے ان میں بیشتر اس غلو و شدت پسندی کا نتیجہ تھے۔ عصر حاضر میں انتہا پسندی دو حیثیتوں سے افتراق امت کا

---

[1]: قادری، محمد طاہر، ڈاکٹر، دنیا کو تہذیبی تصادم سے بچایا جائے، منہاج القرآن پبلشرز لاہور، ص:5

سبب بنی ہوئی ہے: ایک منہج اعتدال سے دوری کی وجہ سے کہ امت کا بڑا طبقہ دانستہ یا غیر دانستہ، اپنی انتہاپسندی کی وجہ سے اعتدال سے دور ہو رہا ہے اور ہر شعبۂ ہائے زندگی میں بے اعتدالی نے راہ پالی ہے۔ دوسرے اس انتہا پسندی کے نتیجہ میں اسلامی غیرت وحمیت کی بجائے جماعتی، تحریکی اور مسلکی تعصب دن بدن شدت اختیار کرتا جارہا ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ اسلام اب فرقوں، جماعتوں اور مسلکوں کے ذریعہ جانا جانے لگا ہے۔

انتہاپسندی کا خاتمہ سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں

انتہاپسندی کی ممانعت

قرآن وحدیث میں مذہبی انتہا پسندی کے لیے "غلو فی الدین" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غُلُوّ فعول کے وزن پر "غَلٰی یغْلُو" سے مصدر ہے جس کے معنی افراط و تفریط اور ہر چیز کے حدود سے تجاوز کرنے کے ہیں۔[1]

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے دین میں غلو سے منع فرمایا ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾[2]

"اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے زائد نہ بڑھو۔"

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں کہتے ہیں:

"اہل کتاب یعنی یہود ونصاری دونوں کو اس حکم کا مخاطب اس لیے بنایا گیا کہ غلو فی الدین ان دونوں میں مشترک ہے اور یہ دونوں فرقے غلو فی الدین ہی کا شکار ہیں کیونکہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے اور ان کی تعظیم میں غلو کیا۔ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا بنا دیا اور یہود نے ان کے نہ ماننے اور رد کرنے میں غلو کیا کہ ان کو رسول بھی نہ مانا۔"[3]

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں آپ ﷺ نے نرمی، اعتدال، آسانی اور محبت و رحمت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے اور تمام اعمال وعبادات اور معاملات و

---

[1] ۔ اصفہانی، حسین بن محمد راغب، المفردات فی غریب القرآن، المکتبۃ المرتضویہ، تہران، ص:365

[2] ۔ النساء: 171

[3] ۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2:619

احکام میں شدت، مبالغے اور انتہا پسندی سے منع فرمایا ہے۔ ایسے تمام مسلمان بھائی جنہیں جہاد کی غلط تعبیرات بتا کر شدت پسند بنا دیا گیا ہے ان کو چاہیے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں اور سمجھیں کہ دین اسلام کی صحیح تعلیمات کیا ہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ایاکم والغلو فی الدین" [1]

"دین میں غلو (یعنی شدت پسندی اور انتہا پسندی) سے پرہیز کرو۔"

نبی کریم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں ہمیشہ اعتدال و توازن کو پسند فرمایا اور اس طرز عمل کو عین دین قرار دیا کیوں کہ قرآن مجید نے بھی "اُمّۃ وَسَطاً" کہہ کر ساری امت کو یہی پیغام دیا کہ یہ امت توازن اور اعتدال کی راہ پر چلنے والی امت ہے۔

نبی کریم ﷺ چودہ صدیاں پہلے شدت پسندی کو رد فرما چکے ہیں اور جو دین آپ ﷺ نے ہمیں عطا کیا، اس کا روشن چہرہ اور شفاف حیثیت ہمارے سامنے واضح کر چکے ہیں کہ دین میں ہر قسم کی انتہا پسندی، شدت پسندی اور مبالغہ پسندی کی راہ غلط ہے، اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ دین نہیں ہے۔ اس لیے کہ:

"انما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین." [2]

"تم سے پہلی قومیں دین میں غلو اور زیادتی (یعنی شدت پسندی اور انتہا پسندی) کے سبب ہلاک ہوئیں۔"

اسلام کا نظریۂ اعتدال

اسلام ایک اعتدال پسند دین ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک حسین توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ اس میانہ روی کو اللہ رب العزت نے صراط مستقیم سے تعبیر کیا ہے اور اسی اعتدال والے راستہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

---

[1] ۔ احمد بن حنبل، المسند، 1:215، رقم:1851

[2] ۔ ایضاً، 1:215، رقم: 1851

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾[1]

"اور یہ کہ یہی (شریعت) میرا سیدھا راستہ ہے سو تم اس کی پیروی کرو، اور (دوسرے) راستوں پر نہ چلو پھر وہ (راستے) تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے، یہی وہ بات ہے جس کا اس نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾[2]

الغرض اعتدال اور میانہ روی کا اصول زندگی کے ہر شعبے میں کار فرما ہے۔ مثلاً عبادات کو لیجیے فرمان الٰہی ہے۔

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا﴾[3]

"اور نہ اپنی نماز (میں قرات) بلند آواز سے کریں اور نہ بالکل آہستہ پڑھیں اور دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ اختیار فرمائیں۔"

چال ڈھال سے متعلق بھی میانہ روی کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾[4]

"اور اپنے چلنے میں میانہ روی اختیار کر، اور اپنی آواز کو کچھ پست رکھا کر، بیشک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔"

---

[1] ۔ الانعام153:6

[2] ۔ البقرہ143:2

[3] ۔ بنی اسرائیل 110:17

[4] ۔ لقمان19:31

اسی طرح خرچ کرنے میں بھی اعتدال کی راہ کو اپنانے کا حکم ہے:

﴿وَلَا تَجعَل يَدَكَ مَغلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبسُطهَا كُلَّ ٱلبَسطِ فَتَقعُدَ مَلُومًا مَّحسُورًا﴾ [1]

نبی کریم نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں اعتدال اور میانہ روی کی تاکید کی گئی ہے۔

میانہ روی کو نبوت کا جزو قرار دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

"والاقتصاد جزء من خمسه وعشرين جزاً من النبوة." [2]

"میانہ روی (تمام حالتوں اور تمام کاموں میں) نبوت کا پچیسواں جزو ہے۔"

احکام شریعت میں تیسیر

اسلام دین فطرت ہے۔ شریعت کے تمام احکام میں انسان کی فطرت اور اس کے مزاج کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انسان چونکہ فطری طور پر کمزور پیدا ہوا ہے اس لیے اس کی فطرت کے پیش نظر اللہ رب العزت نے اس کے لیے سخت احکام نازل نہیں فرمائے بلکہ فرمایا:

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [3]

"اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ﴾ [4]

"اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے۔"

نبی کریم ﷺ نے بھی نرمی کرنے اور اپنے رویہ میں سختی اور انتہا پسندی سے منع فرمایا ہے:

"يسروا ولاتعسروا، وبشروا ولاتنفروا." [5]

---

[1]: بني اسرائيل 29:17

[2]: ابو داؤد ، سليمان بن الأشعث بن إسحاق ،سنن ابی داؤد، المكتبه العصريه، بيروت ،2010ء،رقم الحديث:1543

[3]: البقره،185:02

[4]: النساء28:04

[5]۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، المکتبه العصریه، بیروت ،2010ء، کتاب العلم، باب ماکان النبیﷺ یتخولهم بالموعظة، رقم الحدیث:69

"دین میں آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو اور لوگوں کو رغبت دلاؤ انہیں متنفر نہ کرو۔"

نماز جو عبادات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"ایها الناس ان منکم منفرین فایکم ماصلی بالنا س فلیوجز فان فیهم الکبیر و الضعیف ذو الحاجة." [1]

"اے لوگو! تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کرتے ہیں۔ پس جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے اسے چاہیے کہ اسے مختصر کرے کیونکہ لوگوں میں بوڑھے، کمزور اور کام کرنے والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو ملاحظہ فرمایا کہ ایک رسی دو ستونوں کے درمیان بندھی ہوئی ہے، آپ ﷺ نے پوچھا یہ رسی یہاں کیوں ہے؟ یعنی (کس مقصد کے لیے بندھی ہے؟) لوگوں نے بتایا کہ یہ ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی رسی ہے، جب وہ (عبادت کرتے کرتے) تھک جاتی ہیں تو اس کا سہارا لے لیتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"حلوه ،ليصل احدكم نشاطه ،فاذا فتر فليرقد" [2]

"اس کو کھول دو! تم میں سے ایک شخص کو چاہیئے کہ وہ اس وقت نماز پڑھے جب وہ فرحت و نشاط محسوس کرے، جب اس پر کاہلی کا غلبہ ہو تو سو جائے۔"

دین و دنیا کا حسین امتزاج

آج ہم زندگی کے ہر شعبے میں افراط و تفریط کا شکار ہیں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص اپنے آپ کو "سب کچھ" اور دوسروں کو "کچھ بھی نہیں" سمجھتا ہے۔ سائنسی علوم پڑھنے والے دینی علوم سے بہت دور ہیں اور دینی علوم والے سائنسی و دنیاوی علوم سے بے بہرہ۔ ایک طبقہ وہ ہے جو عورتوں کو تعلیم دلانے کے حق میں نہیں ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو انہیں ڈانس و میوزک کی تعلیم دلواتا ہے۔ ایک طبقہ پردے کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ ہوا تک جسم کو نہ چھو سکے، اور دوسرے طبقے میں آزادی کے نام پر اتنی عریانی ہے کہ باحیا لوگ آنکھ اُٹھا کر نہیں چل

---

[1] ۔ صحيح البخارى، رقم الحديث: 7159

[2] ۔ ايضاً،رقم الحديث:1150

سکتے۔ ایک طبقے میں اتنی شدت ہے کہ بے نمازی کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں اور دوسرے طبقے میں اتنی نرمی ہے کہ نیک عمل کرنے والے کافر کو جنتی ٹھہرا دیتے ہیں۔ الغرض افراط و تفریط ہماری طبیعتوں میں رچ بس چکی ہے۔ ہمیں ضرورت ہے ایک ایسی شخصیت کی اور ایک ایسے نظام کی جو ہمیں کامل نمونہ فراہم کرے، تو وہ ذات نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور وہ نظام مدینہ منورہ کا نظام ہے جو ہمیں مکمل ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[1]

"فی الحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونۂ (حیات) ہے۔"

نبی کریم ﷺ کے دور کی ایک خاصیت یہ تھی کہ مدینہ کا معاشرہ اور ریاست افراط و تفریط سے پاک تھی۔ وہاں ہمیں دین اور دنیا کا ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے کہ نہ دنیا کی وجہ سے دین متاثر ہوا اور نہ ہی دین کی وجہ سے دنیا، بلکہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ نبی کریم ﷺ اپنی شب و روز کی عبادات کے ساتھ دنیاوی مہمات کو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کے عملی نمونے نے آپ ﷺ کو ایک بے مثل ہستی اور صاحب اُسوہ بنا دیا جس کے اتباع سے انسان اپنی منزل مقصود تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو شاندار تہذیب اور ثقافتی اقدار کا حامل ہے۔ قرآن حکیم اور سیرت مبارکہ میں اس پہلو کو پوری جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾[2]

"اور تو اس (دولت) میں سے جو اللہ نے تجھے دے رکھی ہے آخرت کا گھر طلب کر اور دنیا سے

---

[1] ۔ الاحزاب 21:33

[2] ۔ القصص، 77:28

(بھی) اپنا حصہ نہ بھول اور تو (لوگوں سے ویسا ہی) احسان کر جیسا احسان اللہ نے تجھ سے فرمایا ہے اور ملک میں (ظلم، ارتکاز اور استحصال کی صورت میں) فساد انگیزی (کی راہیں) تلاش نہ کر، بیشک اللہ فساد بپا کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔"

معاشی ناہمواری کا خاتمہ

نبی کریم ﷺ کی معاشی سرگرمیوں سے ہمیں جامع رہنمائی ملتی ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ معاشی سرگرمیوں سے صَرف نظر کر کے نہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی جاسکتی ہے نہ حقوق العباد کی ادائیگی، بلکہ پوری زندگی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے نہ صرف فلاحی معیشت کے اصول و ضوابط دیے ہیں بلکہ اس حقیقت کو بھی واضح کیا کہ معاشرے کے اندر اعلیٰ اخلاقی اقدار کا قیام بھی صحت مند، منصفانہ اور عادلانہ نظام معیشت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾[1]

"اور (یہ) وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا (زیادتی اور کمی کی) ان دو حدوں کے درمیان اعتدال پر (مبنی) ہوتا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"فشرع الله عدل بين الغالى فيه والجافي عنه لا إفراط ولا تفريط."[2]

" پس اللہ تعالیٰ نے اس میں غلو کرنے والے اور اس سے اعراض کرنے والے کے درمیان عدل قائم کر دیا بغیر افراط و تفریط کے یعنی اس میں نہ افراط رہا اور نہ تفریط۔"

اسلامی تعلیمات کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے میں اعتدال کی روح پائی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے معاشی سرگرمیوں کو بھی اعتدال کے ساتھ مشروط کرتے ہوئے، فرمایا:

"الإقتصاد في النفقة نصف المعيشة".[1]

---

[1] ۔ الفرقان، 25 : 67

[2] ۔ ابن كثير، اسماعيل بن عمر ، ابو الفدا، تفسير القرآن العظيم، دارالمعرفه،بيروت لبنان،1980، 2 : 89

"خرچ میں اعتدال آدھی معیشت ہے۔"

دوسری حدیث شریف میں فرمایا:

"ما عال من اقتصد." [2]

"جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہو گا۔"

نبی کریم ﷺ نے جہاں مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اسراف و تبذیر سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ یہ وہ عوامل ہیں جن سے طبقات معاشرہ میں ناہمواری جنم لیتی ہے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے جس کی وجہ سے غریبوں کے دلوں میں نا امیدی، مایوسی، بے بسی، مجبوری اور حسد کی آگ جلتی ہے جو انہیں بغاوت، شدت، انتہا پسندی، قتل و غارت اور خود کشیاں و خود سوزیاں کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لہٰذا معاشرے کو فساد اور انتشار و افتراق سے بچانے کے لیے اسلامی نظام معیشت پر عمل درآمد بہت ضروری ہے۔

تکریم انسانیت

حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا:

"مرت بنا جنازة فقام لها النبیﷺ و قمنا له، فقلنا: یا رسول الله ، انها جنازة یهودی ؟ قال: اذا اریتم الجنازة فقوموا" [3]

"ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو نبی کریم ﷺ کھڑے ہو گئے اور آپ کے ساتھ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ہم عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ جس میت کے لیے آپ نے قیام فرمایا ہے، یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آقا ﷺ نے جواب دیا:

أليست نفساً؟ [4]

---

[1] ۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد المعجم الأوسط،دار الکتب العلمیه،1983، 25، رقم : 6744

[2] ۔ طبرانی،ابو القاسم سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، مطبع زیرا الحدیثیه،عراق، 10 : 108، رقم : 10118

[3] - بخاری، کتاب الایمان، باب من قام لجنازة یهودی، رقم الحدیث: 1249

[4] ۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب من قیام لجنازة یهودی، رقم الحدیث: 1250

"کیا یہ انسان نہیں؟"

اس موقع پر آپ ﷺ کے قیام کا مقصد تکریم انسانیت تھا۔ چونکہ اسلامی شریعت میں تکریم انسانیت پہلے ہے اور تکریم مذہب بعد میں ہے اسی لیے آقا ﷺ نے استفسار فرمایا کہ کیا یہ انسان نہیں تھا؟ گویا نبیٔ کریم ﷺ نے انسانی جان کی تکریم کی ہے قطع نظر اس کے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ یہ ایک یہودی تھا جس کی تکریم کا ہمیں نبیٔ کریم ﷺ حکم دے رہے ہیں۔ ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنا چاہیے کہ کیا ہم ایک غیر مسلم کو، دوسرے مذہب کے، دوسرے فرقے کے، دوسری قوم کے، دوسری زبان کے زندہ انسان کو وہ عزت دیتے ہیں جو نبیٔ کریم ﷺ نے ایک یہودی کی میت کو دی؟

غربت کا خاتمہ کرنا

انسان کے لیے اس کی بقا سب سے مقدم ہے اس لیے ایسے ابتر حالات میں ہر شخص ہر وقت اپنی بقا کی خاطر سرگرداں رہتا ہے۔ ایسی صورتحال میں جس کا جتنا بس چلتا ہے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ چنانچہ انسان بعض اوقات انتہائی اقدامات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مذہبی بے چینی اور فرقہ واریت اسی کی پیداوار ہیں جو بالآخر انتہا پسندی کے باعث بنتی ہے۔

یہ برائیاں زبانی تقاریر، دروس حسن سلوک، اخلاقیات کی تلقین سے نہیں دور ہوں گی بلکہ اس کے لیے حکومتی حکام کو غربت کے خاتمہ کے لیے اقدامات کرنا ہوں گے۔

نرم خوئی کی تلقین

نبیٔ کریم ﷺ نے غیظ و غضب اور کبر و غرور کی جگہ ہمیشہ نرمی اور حسنِ خلق کی تعلیم دی ہے کیونکہ اس سے ہی امن و امان اور اخلاق کے قوانین کو قوت حاصل ہوتی ہے اور قوم و ملک فتنہ و فساد سے بڑی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔ اگر ایک فریق سخت ہو اور دوسرا اس کے مقابلہ میں نرمی کی پالیسی اختیار کر لے تو یقیناً مشتعل جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ آپ ﷺ نے رفق کے پہلو کو اختیار کر کے فرمایا:

"ان الله رفيق يحب الرفق و يعطى على الرفق مالا يعطى على العنف وما لا

يعطى على ما سواه" [1]

"بے شک اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور وہ نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ سختی اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں پر نہیں عطا فرماتا۔"

انسانی رویوں میں غصہ کی ممانعت

امن وامان اور سکون واطمینان کو جو چیزیں برباد کرتی ہیں ان میں بے موقع غصہ بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے بھی سختی سے منع فرمایا کیونکہ غصہ انسان کو حدِ اعتدال پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ وصیت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو، اس نے بار بار اپنا سوال دہرایا۔ مگر آپ نے یہی جواب دیا:

"لا تغضب۔" [2]

"غصہ نہ کیا کرو۔"

اخوت وبھائی چارے کا قیام

اسلام نے اپنی آمد کے بعد انسانیت کی منتشر صفوں میں اتحاد و الفت اور اخوت کی روح پیدا کی۔ ایک دوسرے کے جانی دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ عداوت، حسد، کینہ اور بغض کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن تو ساری دنیا کے اہل کتاب کو دعوت اتحاد دیتے ہوئے کہتا ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ [3]

"آپ فرمادیں اے اہلِ کتاب! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔"

دوسری طرف اُخوت اسلامی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہے:

---

[1]۔ مسلم، ابن الحجاج القشیری، الصحیح، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبان، کتاب البر والصلة والاداب، باب فضل الرفق، رقم الحدیث:2593

[2]۔ صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحدیث:6116

[3]۔ آل عمرآن 64:3

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[1]

"بات یہی ہے کہ (سب) اہلِ ایمان (آپس میں) بھائی ہیں۔ سو تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرایا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

ان آیات مقدسہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام دنیا میں امن و آتشی کا دین ہے جو چار دانگ عالم میں اتحاد و اتفاق کے پرچم بلند کر کے پوری دنیائے انسانیت کو وحدت کی لڑی میں پرونا چاہتا ہے۔

قانون کی حکمرانی

قانون سب کے لیے ایک جیسا ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو بعض کے لیے قانون متحرک ہو اور بعض کے لیے جامد۔ قانون کی حکمرانی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک پولیس، عدلیہ اور کمیونٹی مل کر کردار ادا نہیں کرتے۔ پاکستان کے بہت سے مسائل کی وجہ قانون پر عمل درآمد نہ ہونا ہے۔ انتظامیہ کو چاہیے کہ ایسی تمام جماعتوں، گروہوں اور تحریکوں کو پنپنے ہی نہ دے جو انتہاپسندی کی سوچ و فکر کو ترویج دیتی ہوں۔

تعصبات کا خاتمہ

آج ہمارے مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ نسلی، علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات کا شکار ہو کر باہم دست و گریباں ہے۔ علاقائی و لسانی تقسیم اور دشمن کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ہم مختلف طبقات میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ اسلام نے تمام قسم کے امتیازات، ذات پات، نسل و زبان، رنگ و جنس، حسب و نسب اور مال و دولت پر مبنی تعصبات کو ختم کر کے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾[2]

---

[1]۔ الحجرات 10:49

[2]۔ الحجرات 13:49

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے اس لیے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (ورنہ) اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل عزت وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

ہمیں بھی چاہیے کہ ان تمام قسم کے تعصبات سے باہر نکل کر عملی مساوات کا مظاہرہ کریں تاکہ معاشرے سے انتہا پسندی کا خاتمہ ہو سکے۔ جس معاشرے میں انتہا پسندی عروج پر ہو اس معاشرے کو دہشتگردی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

عالمی امن کا قیام

دور حاضر میں امت مسلمہ کے لیے اپنی فکری، سیاسی اور مذہبی آزادی کا تحفظ ایک چیلنج بن چکا ہے اور امن عالم نئے خطرات سے دوچار ہو گیا ہے۔ ان عصری بین الاقوامی حالات کے تناظر میں سیرت محمدی کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے کیونکہ امت مسلمہ کو درحقیقت نیو ورلڈ آرڈر تو سیرت محمدی ﷺ کے ذریعے دیا جا چکا ہے۔

نبی کریم نبی اکرم ﷺ نے 10ھ میں آخری حج ادا فرمایا جسے حجۃ الوداع کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس موقع پر 9 ذی الحجہ کو میدان عرفات میں آپ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا جو عالم انسانیت کے لیے پہلا باقاعدہ انسانی حقوق کا چارٹر اور اقوام عالم کے لیے نیا عالمی نظام تھا۔

اس اسلامک ورلڈ آرڈر کا سب سے اہم پہلو عالمی سطح پر قیام امن تھا۔ اقوام، ممالک اور قبائل ہمہ وقت قتل و غارت گری اور جنگ و جدال کے فساد انگیز عمل میں مبتلا رہتے تھے۔ قبائل میں لامتناہی جنگوں کے سلسلے جاری رہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان ہولناک حالات میں عالمی سطح پر قیام امن کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا:

"فان دماءكم و اموالكم و اعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا فى بلدكم هذا فى شهركم هذا." [1]

"اے بنی نوع انسان! بیشک تمہاری جانیں اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام کر دی گئی ہیں جس طرح آج کے دن کی حرمت اور اس مہینہ کی حرمت تمہارے اس شہر میں برقرار

---

[1] - صحيح البخاري، كتاب الحج، باب الخطبة ايام منى، رقم الحديث: 1739

ہے۔"

دور حاضر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمی برداشت کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ یہ صرف عالم اسلام کے لیے نہیں بلکہ پوری دینا کی ضرورت بن چکا ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات اور اسوہ و سیرت کے ذریعے انسانیت کو وہ نظام زندگی، حقوق و فرائض، احکام و آداب اور اوامر و نواہی عطا فرمائے ہیں جن کو عملاً اپنانے اور نافذ کرنے سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

> "اسلام کی تاریخ میں یہ نیو ورلڈ آرڈر آج بھی دنیا کو ایسے اصول فراہم کرتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کو رسول پاک ﷺ کے عطا کیے ہوئے ورلڈ آرڈر کی موجودگی میں کسی اور ورلڈ آرڈر کی ضرورت نہیں۔"[1]

خلاصۂ بحث

اسلام ایک اعتدال پسند دین ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک حسین توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ظاہری اعمال کے ساتھ فکر و خیال اور طبیعت میں بھی اعتدال کی راہ کو اپنایا جائے۔ اسلام زندگی کے ہر شعبے مذہب، سیاست، معاشرت اور معیشت میں معتدل سوچ کی تعلیمات دیتا ہے۔ اسلام کے اس بنیادی اصول یعنی اعتدال و میانہ روی کو اپنی زندگی کے ہر کام اور ہر عمل میں اختیار کرنا چاہیے خواہ وہ عمل انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہو یا اجتماعی زندگی سے یعنی عقائد و عبادات، معیشت، معاشرت، سیاست و حکومت، لباس و خورد و نوش، سلام و کلام، خوشی و غمی، تقریبات و تہوار، جلسے و دھرنے اور باہمی معاملات، غرض یہ کہ ہمیں چاہیے کہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے گوشے میں اسلام کے سنہری اصولوں یعنی اعتدال و میانہ روی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ معاشرتی و معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کر کے مساوات اور عدل و انصاف کے کلچر کو عام کیا جائے، بے روزگاری کی وجہ سے لوگ پریشانی اور ڈپریشن کا شکار ہو کر قتل و غارت اور انتہاپسندی و دہشتگردی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ریاست مدینہ میں بے روزگاری کے خاتمے کے لیے نبیٔ

---

[1]: قادری، محمد طاہر، ڈاکٹر، مقدمہ سیرت رسول، منہاج القرآن پبلیکیشنز، 394:2

کریم ﷺ نے اخوت و بھائی چارہ کے نظام کو متعارف کروایا، لہٰذا غربت و بے روزگاری کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے معاشرے میں اگر دہرا رویہ رکھا جائے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جائیں تو اس کی وجہ سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مایوس لوگ یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا انتہا پسندی والا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دہرے معیار کے خاتمے کے لیے نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر مساوات انسانیت کا درس دیا۔، احترام آدمیت کا یہ عالم تھا کہ نبی کریم ﷺ خود ایک یہودی کی میت کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں، عدالتی نظام کو زیادہ سے زیادہ سہل بنا کر مظلوموں کے ظلم کا ازالہ کیا جائے اور جلد سے جلد انصاف مہیا کیا جائے۔ عالمی طور پر برداشت کے کلچر کو عام کیا جائے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات کو آسان کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ امت کے تمام مکاتب فکر میں اتفاق و اتحاد، صبر و تحمل ، بین المذاہب عالمی اتحاد، یگانگت و ہم آہنگی، اعتدال پسندی و روشن خیالی اور وسعت نظر کے اصولوں کو اپنایا جائے، اور اختلاف رائے کو علمی سطح تک محدود رکھا جائے۔

صہیونی توسیعی عزائم اور مغربی طاقتوں کا کردار

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

ابوالحسن احمد*

ڈاکٹر محمد امین**

ABSTRACT

It is a critical study of Western Civilization's interest in the Pax Judaica using the Biblical Eschatology. The Protestant Europe had keen interest in the Holy Land during the crusade wars. In the colonial period Palestine was handed over to the Zionists. Now Israel is a well-established regional power due to the continuous support of USA. The Zionist determinations of expansions lead Israel to become a ruling state of the world having the capital of Jerusalem. Comparing it to the teachings of Islam it will be the New World Order of the False Messiah at the end of times.

Keywords: صہیونی، واشنگٹن، اسرائیل، مغربی تہذیب، صلیبی، برطانوی، اٹوٹ انگ

ارض مقدس میں صہیونی غاصبانہ قبضے کے بعد سے مشرق وسطیٰ امن کا گہوارہ نہیں بن پایا۔ نام نہاد اسرائیلی ریاست انبیائے کرام علیہم السلام کی سرزمین کو اپنے ظلم وستم سے مسلسل روند رہی ہے جس کے توسیعی عزائم تھمنے کا نام نہیں لے رہے۔ یروشلم میں پہلے سے خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی جارہی ہے تو وہاں موجود خدائے ابراہیم علیہ السلام کے معبد کی جگہ نیا معبد بنانے کی کیا ضرورت ہے

* پی ایچ۔ڈی سکالر، دی یونیورسٹی آف لاہور

** پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور

درآں حالیکہ لادین و روشن خیال عالمگیریت نے دنیا کو مہذب بنا دیا ہے جس میں عقیدے کی لڑائی کو اساطیر الاولین کہہ کر انتہاء پسندی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسرائیلی محکمہ آثار قدیمہ مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کے لیے اصحاب السبت کی طرح سرنگیں کھود کر جو حیلہ سازی کر رہا ہے اس کے پیچھے بین المللی سیاسی عزائم ہیں کیونکہ اقصیٰ اور بابری مساجد گرائے بغیر گریٹر اسرائیل اور مہابھارت بنانا ممکن نہیں۔ امت مسلمہ کے خلاف مؤحد یہود اور مشرک ہنود کا گٹھ جوڑ عجیب نہیں۔ قرآن کریم کی تنبیہ کے مطابق نبی اکرم ﷺ سے بُغض نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں مغرب سے مرعوب طبقہ سب کچھ فراموش کر کے ایک حقیقت کے طور پر اسرائیل کو تسلیم کیے جانے حق میں میثاق مدینہ جیسے دلائل مسلسل دے رہا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ غزوہ خندق و خیبر کے اسباب کو فراموش کر دیتا ہے۔

دوستی دشمنی رکھتے ہوئے بھی اقوامِ عالم باہم سفارتی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن مسئلہ فلسطین، بوسنیا، میانمار، مشرقی تیمور یا کشمیر سے منفرد مسئلہ ہے کیونکہ یہاں صرف مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کرنا یا انہیں محکوم بنانا مقصود نہ تھا بلکہ دنیا بھر سے یہودیوں کو یہاں آباد کرنے کے لیے فلسطین کو صدیوں سے بے آباد قرار دیا گیا۔

مغربی تہذیب اور صہیونی تحریک کی ہم آہنگی

مسیحیوں کی مسلمانوں سے محبت اور نرم دلی میں مغربی تہذیب رکاوٹ ہے جس نے نصاریٰ کے ایک بڑے طبقے سے مسیحیت چھین لی ہے جس کے ملی اتباع کے بغیر مسلمان اس کی خوشنودی نہیں پاسکتے۔ قیام اسرائیل کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ مغرب میں یہود سے بدتر معاشرتی سلوک ہوتا رہا ہے۔ انہیں مسیح کے قاتل کے طور پر یورپ کے دور ظلمت اور دور تنویر میں غیطو (Ghettos) میں محصور کیا گیا اور نازیوں کی طرح کئی متعصب گروہوں کے ہاتھوں ان کی گیس چیمبر میں یا دیگر طریقوں سے نسل کشی کی گئی۔ ظلم قلیل ہو یا کثیر، اس کے بدلے میں کسی بے بس قوم کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔

لیگ آف نیشنز کے برطانوی انتداب سے فائدہ اٹھا کر یہود عازم ارض مقدس ہوئے تو اپنی اس ہجرت کو ایلیاہ کا نام دیا۔ اسرائیلی آبادکاری نے فلسطینیوں سے ان کی آبائی زمین ہتھیالی اور اب وہ اسرائیل میں اقلیت بن کے رہ رہے ہیں۔ عرب ممالک میں ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہے۔ اسی لیے ایک دنیا میں بکھری قوم کی اپنے آباءواجداد کی سرزمین کو واپسی نے دوسری قوم کو دنیا کے طول و عرض میں بکھیر دیا ہے۔

یہودی بستیوں کی مسلسل تعمیر سے آبادی کا توازن خراب ہونا شروع ہوا۔ اسرائیل میں ابتدائی حکمران لیبر پارٹی کی روسی نژاد معاشرت نے بکثرت اشتراکی بستیوں (Kibbutz) کا روپ دھار لیا تھا۔ پھر لیکوڈ پارٹی کی سوچ پروان چڑھی تو غیر یہود (Goyim) سے نفرت نے (Mazaraki) بستیاں تشکیل دیں۔ جب اسرائیل کی ابتدائی سرحدیں بنائی گئیں تو طے پایا کہ فلسطینی آبادیوں کی بجائے سڑک پر اسرائیلی قانون کا اطلاق ہو گا۔ 1967ء میں مقبوضہ آبادیوں کے محاصرے کی غرض سے شاہراہوں کا جال بچھا دیا گیا۔ دلیر صہیونی رضاکاروں نے مقبوضہ علاقوں کی سڑکوں اور انٹرچینجز پر (Gush Etzion) جیسے آبادی کے بلاک بنائے جو اب اسرائیلی تزویراتی قلعے ہیں۔

مشرقی یہود (Sephardic) صدیوں سے مسلم معاشروں میں رواداری سے رہ رہے تھے۔ صہیونی مظالم کے نتیجے میں ان کے لیے اب عرب ممالک میں خوشگوار سماجی تعلقات کی ضمانت نہ تھی۔ جدید حکومتوں میں معاشی اثر اندازی اور اسرائیل کے مخدوش حالات میں موت کے ڈر سے بیرون اسرائیل مقیم یہودی (Diaspora) چاہتے ہوئے بھی اپنی خوابوں کی سرزمین کا رخ نہیں کر رہے۔ مغربی تہذیب کی یک چشم ریشہ دوانیاں علمائے اسلام کی بصیرت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہیں جیسے مولانا سید بدر عالم بتاتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں یہودی مملکت کے قیام اور ان کی متفرق طاقتوں کے ایک مرکز پر جمع ہونے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور مقدر ہے اور اگر اسے دجالی فتنے کا مقدمہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا[1]۔ اسی طرح ولندیزی نژاد دانشور Hajo Gamier یہودی صفوں میں صہیونیت مخالف منفرد آواز ہے جس کے مطابق انسانیت کے ناطے اخلاقی فرض ہے کہ ظالم نہ بنا جائے۔ تلخ ذاتی تجربے میں ہولوکاسٹ کی کسک، فلسطینیوں کی اپنی سرزمین پر حالت دیکھ کر، انہیں چپ نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ اسرائیلی اور جرمن نازیوں کی پالیسیوں پر تنقیدی و تقابلی نظر ڈالتے ہیں۔ نیز عصری اسرائیلی معاشرے کی وجہ سے وہ یہودیت کے اختتام کا رونا روتے ہیں[(2)]۔

---

[1]- مہاجر مدنی، سید بدر عالم، دجالی فتنہ کی تفصیلات حدیث کی روشنی میں، اسلامی کتب خانہ، لاہور، س ن، ص226

[2] Meyer, Hajo G. The End of Judaism, Create Space Independent Publishing Platform, USA, 2013, p:217

نشاۃ ثانیہ کے متلاشی ایشکنازی یہود[1] نے عالمی طاقت بننے کا سپنا دیکھا تھا جن کے رہنما تھیوڈور ہرزل نے صہیونی عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ حالات وواقعات بتاتے ہیں کہ عالمی جنگوں کی فاتح صہیونی تحریک ہے جس نے فریق جنگ بنے بغیر مال غنیمت سمیٹا ہے۔ اپنے خوابوں کی عملی صورت گری کے لیے صہیونی دانا بزرگوں نے سر جوڑ لیے جن سے منسوب پروٹوکول نامی دستاویز ان کے منصوبے آشکار کرتی ہے جسے اپنانے سے انکار کے باوجود نتائج بتاتے ہیں کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے:

> "ممکن ہے کچھ عرصے تک دنیا کی غیر یہودی اقوام کا اتحاد ہمارے خلاف کامیاب رہے لیکن ہمیں اس خطرے سے ان کے وہ باہمی اختلافات محفوظ رکھ سکتے ہیں جو اس قدر گہری جڑیں رکھتے ہیں کہ جنہیں پاٹنا ممکن نہیں۔ ہم نے غیر یہودی شخصیتوں اور اقوام کو آپس میں لڑا دیا ہے اور ان میں نسلی و مذہبی منافرت انتہا کو پہنچا دی ہے، جس کی ہم گذشتہ بیس صدیوں سے آبیاری کرتے رہے ہیں۔"[2]

مغربی تہذیب کی صہیونی پشتیبانی اب سمجھ میں آتی ہے۔ وہ اپنے غروب آفتاب کو اختتام تاریخ کا نام دیتی ہے اور یروشلم پر یہود کا قبضہ کرا کے وہ مستقبل کے سہانے سپنے جاگتی آنکھوں دیکھنا چاہتی ہے گویا کہ وہ یہود کو یاد ماضی کرانا اپنے لیے نوید سحر سمجھتی ہے۔ اشاعت اسلام کی راہ روکنا عصر حاضر میں مغربی تہذیب کا ایک اہم ہدف ہے۔ جس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ اس کے ایک ترجمان کے بقول امیگریشن اور آبادی میں اضافے

---

[1]۔ ایشکنازی یہود، سامی نژاد بنو اسرائیل کی بجائے مغربی یورپ کے باشندوں کی طرح بنو یافث ہیں۔ بائبلی نسب نامے کے مطابق ماجوج بن یافث اور اشکناز بن جمر بن یافث چچا بھتیجا ہیں (پیدائش: 10:2 تا 5، نیز 1۔ تواریخ، 1:5۔7)۔ بابل کی اسیری کے دور میں حضرت حزقی ایلؑ نے بحکم الٰہی ماجوج نژاد فرمانروا جوج کو تنبیہ فرمائی تھی جس کے لشکر میں بنو جمر شامل تھے (حزقی ایل: 38 :6)۔ اسی لیے ایشکنازی یہود کے پہلے ایلیاہ نے جب بحیرہ طبریہ عبور کیا تو علامہ اقبال نے سورۃ الانبیاء کی آیات نمبر 95، 96 کو ملا کر توسیعی تفسیر کرنے کی تاکید کی تھی (بانگ درا، ص 23)۔ مسلسل پانی لے کر اسرائیل کا آبی وسائل کا محکمہ بحیرہ طبریہ کو خشک کرتا چلا جا رہا ہے۔ احادیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ یاجوج ماجوج کا لشکر دجال کے قتل کے بعد حملہ آور ہو گا لیکن اس کا ہراول دستہ بحیرہ طبریہ کو خشک کر دے گا اور دجال کے خروج سے پہلے کی ایک علامت طبریہ کا خشک ہو جانا ہے یوں مذکورہ دستہ خروج دجال سے قبل ہے۔ واللہ اعلم! علامہ اقبال کا شعر ہے:

کھل گئے ہیں یاجوج ماجوج کے لشکر تمام　　چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون

[2]۔ مارسڈن، وکٹر ای، پروٹوکول، ترجمہ ابن حسن، مسلم ورلڈ ڈیٹا پراسیسنگ پاکستان، 2002ء، ص 50

کی زیادہ شرح کی وجہ سے یورپ تیزی سے مسلم وجود میں بدل رہا ہے۔ چند عشروں میں پانچ کروڑ مسلمان براعظم یورپ کو مسیحی سے مسلم میں بدل دیں گے جن کا انسانی حقوق کا ریکارڈ ابتر ہے اور شرعی قوانین کے چہرے والا یورپ یہودیوں اور مسیحیوں کے لیے مہمان نواز نہ ہو گا۔ معمر قذافی کی پیشینگوئی کہ بغیر تلوار یا بندوق سے فتح کے، اللہ اپنی نشانیوں سے اسلام کو یورپ میں کامیابی دے رہا ہے لہٰذا ہمیں دہشت گرد اور خونریز بمبار نہیں چاہئیں، سچ ثابت ہو رہی ہے[1]۔

نو آبادیاتی دور میں صلیبی فکر کا تسلسل

یورپ کی علمی ترقی اور اس کی تہذیب کے ارتقاء میں مسلمان اور یہودی مفکرین نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن ترقی یافتہ مغربی تہذیب کی سوچ صلیبی امنگوں سے آراستہ ہے جس کے برپا کردہ نو آبادیاتی دور کی بڑی طاقت برطانیہ نے اپنے مفادات کی خاطر اعلان بالفور کی مفاد پرستانہ پالیسی سے یہود مسلم تعلقات پر اثر اندازی کی طرح ڈالی۔ مغرب کی سربلندی کا عزم لیے شارلیمان[2] کے جانشینوں نے جب صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا تو مسیح علیہ السلام کے قاتل نظر انداز نہ کیے گئے۔ صلیبیوں کے یروشلم پہنچنے اور قبضے کے دوران یہود و مسلم کا قتل عام کیا گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح القدس اور پھر رچرڈ شیر دل سے 1192ء میں صلح سے امن کی امید ابھری لیکن 1492ء میں سقوط غرناطہ ہوا تو جلاوطنی نہ کرنے والے یہودیوں اور مسلمانوں کو تبدیلیٔ دین کے باوجود بالترتیب Marranos اور Moriscos کے امتیازی القابات سن سن کے مسیحی سپین میں رہنا پڑا۔

عالمی طاقتوں کی حکمت عملی میں عدل کی بجائے مفاد کی اہمیت ہے۔ General Edmund Allenby نے 1917ء میں عثمانی ترکوں کے سرخ ہلالی پرچم کو سرنگوں کرتے ہوئے عربوں کی تالیوں کی گونج میں نیلگوں صلیبی برطانوی پرچم لہرایا تو اس نے آخری صلیبی جنگ کا نعرہ لگایا تھا جو سچ ثابت ہوا کیونکہ فلسطینی ایک

---

[1]- Will Israel Survive the End Times? Associated Bible Students, Oakland, 2012, p:6

[2]۔ شارلیمان (Charlemagne) یا چارلس اول مغرب کے دور ظلمت کا پہلا شہنشاہ ہے جس نے مغربی یورپ کو متحد کر کے پہلی بار عملی طور پر یورپی یونین بنائی اور خلیفہ ہارون الرشید سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ قسطنطنیہ کی بازنطینی ایمپائر، مشرقی آرتھوڈوکس کی سیاسی طاقت تھی جس نے ارض مقدس کی بازیابی کے لیے وہ تندہی نہ دکھائی جو کیتھولک مغربی یورپ کے حصے میں آئی جن میں سے پروٹسٹنٹ جلوہ گر ہوئے۔ مؤخر الذکر دونوں مسیحی مذاہب کی بپا کردہ تہذیب مغربی تہذیب کہلاتی ہے جب کہ اشتراکیت سے تائب روس مشرقی آرتھوڈوکس کی تہذیب کی مرکزی ریاست ہے۔

صدی سے صلیبی کی بجائے داؤدی ستارے کے علمبر داروں سے بر سر پیکار ہیں۔ یک قطبی نظام میں نائن الیون کے واقعے نے امریکی صدر جارج بش کے منہ سے بھی صلیبی جنگ کی نئی کڑی کی بات منہ سے نکلوادی تھی۔ اسماعیل راجی الفاروقی بجا کہتے ہیں کہ مسلم دنیا جدید نو آبادیاتی نظام اور صلیبی جنگوں کے مسائل کا سنگم بن گئی ہے۔ بلاشبہ اسرائیل ان دونوں میں سے نہیں لیکن وہ ان دونوں سے بڑھ کے ہے۔[1] برطانوی انتداب کے خاتمے پر زمینی حقائق اتنے بدل چکے تھے کہ 1948ء میں ڈیوڈ بن گوریان نے امریکی ایماء پر قیام اسرائیل کا اعلان کر دیا۔

خلافت کے خاتمے میں مغربی و صہیونی فوائد

نو آبادیاتی دور میں آزادی کے وقت کی قائم کردہ سرحدیں اب امریکہ کو پسند نہیں آرہیں جن میں درستی کے لیے مضبوط حکومتیں گرا کر عرب بہار کی انقلابی تحریکیں یا سنی داعش اور شیعہ حوثی جیسی عسکریت پسند تنظیمیں ابھاری گئیں اور پھر ان کی سرکوبی کے لیے اسرائیل کے گرد و پیش کو ملبے کے ڈھیر میں بدلنے کی پالیسی وضع کی گئی۔ جنگ عظیم اول میں شکست کے باوجود خلافت عثمانیہ قیام اسرائیل میں مزاحم تھی اور مارچ 1924ء میں سقوط خلافت سے مسلمانوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اتحادیوں کے لیے تب کھلی چھوٹ تھی۔

امریکی دھڑلے سے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کو اپنی کامیابی گردانتے ہیں۔ امریکی صہیونی مصنف احسان جتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ عربوں کو واقعی عرب ریاستوں کی آزادی میں امریکی کردار کا ممنون ہونا چاہیے۔ تمام اقوام کے تشخص کے لیے صدر ولسن کے اقدامات اور امریکہ کی پہلی جنگ عظیم میں شمولیت عثمانی سلطنت کے انہدام کی وجہ بنی جس نے عرب دنیا کی آزادی کی تحریک ابھارنے میں مدد دی۔[2] امریکہ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اکیسویں صدی صرف اس کے نام کی شمار کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے تھنک ٹینک اسلامی ممالک کی سرحدوں کو خون آلود بتاتے ہیں اور اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لیے اسرائیل کو خطے کی بڑی طاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسرائیل کے پیدا کردہ حقیقی انسانی مسئلے کو اہمیت نہیں دی جاتی کیونکہ اس کے ظلم کا شکار مسلمان ہیں جن کا قصور یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب مانتے ہیں۔ کرنل پیٹر کا مسلم دنیا کے لسانی یا فرقہ وارانہ حصے بخرے کرنے کی تجویز میں یہود مسلم تعلقات میں بہتری کے امکانات سے غفلت کا استدلال یوں ہے کہ امریکی قارئین کے لیے اسرائیل اور اس کے ہمسایوں میں پر امن بقائے باہمی کی امید حساس ترین مسئلہ ہے۔ جس سے ابتداء کرتے ہوئے ماقبل 1967ء کی سرحدوں پر واپسی واحد حل ہے۔ اسے ایک طرف رکھ کے وہ معاملات سلجھاتے ہیں

---

[1]- Al-Faruqi, Dr. Isma'il Raji, Islam and the Problem of Israel, ICE, London, 1980, p25

[2]-Bard,Mitchel G, Myths & Facts, American Israeli Cooperative Enterprise USA, P:229

جنہیں مطالعہ میں نظر انداز کیا گیا ہے۔[1]

صہیونی ریاست کے استحکام میں امریکہ کا قومی مفاد

سرد جنگ کے خاتمے اور خاص طور پر نائن الیون کے بعد برطانیہ اور فرانس کی عسکری مشاورت سے امریکہ دنیا کے فیصلے کر رہا ہے۔ جہاں فعال یہودی لابی امریکی خارجہ پالیسی پر کنٹرول رکھے ہوئے ہے۔ ان مفاد پرستانہ پالیسیوں کو رائے عامہ میں قبولیت دینے کے لیے قومی مفاد کا بہانہ حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ڈینیئل ایمن (Daniel Byman)اور سارا مولر (Sara Moller)پٹرول کی آزادانہ فراہمی، نیوکلیائی عدم پھیلاؤ، دہشت گردی سے نبرد آزمائی، اسرائیلی تحفظ و بقاء اور جمہوریت کی ترقی کو مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات بتاتے ہیں۔ ایران، داعش اور القاعدہ فی الوقت مذکورہ مفادات کے لیے حقیقی خطرہ ہیں۔[2]

یہودی لابی واشنگٹن کو اپنا ہمنوا بنا چکی ہے جہاں دلائل دیے جاتے ہیں کہ تین ہزار سال سے یروشلم یہودیوں کی خواہشات کا مرکز رہا ہے تاریخ، ثقافت، مذہب اور لوگوں کے یقین میں کسی اور شہر نے ایسا جاندار کردار ادا نہیں کیا جو یہودیت کی حیات میں یروشلم نے کیا ہے۔ جلاوطنی کی تمام تر صدیوں میں یہودی جہاں کہیں بھی تھے یہ ان کی تاریخ کا مرکزی نقطہ، عظمت، اخلاقی بجاآوری اور تجدید کی علامت بن کے ان کے دلوں میں زندہ رہا۔ ان کے قلب و روح نے یہ صورت گری کی ہے کہ اگر آپ ایک سادہ لفظ کو یہودی تاریخ کی علامت بنانا چاہیں تو وہ یروشلم ہو گا۔[3]

امریکہ میں بیٹھے بزرجمہروں کے دل اسرائیلی مفادات کے لیے تڑپتے رہتے ہیں کیونکہ یہودی لابی انہیں جھانسہ دینے میں کامیاب ہو چکی ہے کہ بھارتی کشمیر کی طرح گولان کی مقبوضہ پہاڑیاں اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہیں بصورت دیگر اسے شام کے زیر کنٹرول چلے جانے والے علاقے سے بحیرہ طبریہ میں بہنے والے پانی کے معیار و مقدار میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آبی امور کے ماہرین کے مطابق کسی اسرائیلی حکومت کی طرف سے یرموک سے آب رسانی یا متبادل ذرائع آب کی ضمانت کے بغیر گولان کے علاقے واگزار کرنا قوم کو قبر کے خدشے میں ڈالنا ہے۔ اسرائیل کے ساحل، پہاڑی علاقے اور بحیرہ طبریہ تاریخی طور پر اس کے بڑے آبی ذرائع ہیں جن سے اسے اپنی ضرورت سے زیادہ پانی

---

[1]-Peters, Ralph, Bloody Borders, Armed Forces Journal, Michael Reinstein Springfield, June 1, 2006 ,p2

[2]-Byman, Daniel & Moller,Sara Bjreg, The United States and the Middle East: Interests, Risks and costs, Tobin project, 2016,p1

[3]-Kollek,Teddy, Jerusalem, Washington Institute for Near East Policy, Washington DC, 1990, p19

ملتا ہے۔ فلسطینی بستیاں اردن کے مغربی کنارے کی بجائے زیادہ تر اندرون اسرائیل سے پانی لیتی ہیں۔[1]

غیر مغربی طاقتوں کی خطے میں دلچسپی پر صہیونی واویلا

قیام اسرائیل کے بعد امریکہ اور سوویت یونین نے فی الفور اسے تسلیم کر لیا جس سے اکثر مسلم ممالک سفارتی تعلقات تک رکھنے کے ہنوز روادار نہیں۔ برنارڈ لیوس استشراقی اور امریکی وکیل صفائی کا حق یوں ادا کرتے ہیں:

> "مشرق وسطیٰ میں سوویت اثر و نفوذ کی توسیع اور اس کے ولولہ انگیز جواب نے امریکہ کو اسرائیل کی طرف زیادہ دوستانہ انداز میں دیکھنے کی حوصلہ افزائی دی، جس کو اب ایک بڑی حد تک دشمن خطے میں ایک قابل اعتماد اتحادی تصور کیا جانے لگا تھا۔ آج اس حقیقت کو اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے درمیان سٹریٹیجک تعلق سوویت دخل اندازی کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ تھا۔"[2]

امریکہ کی غیر معمولی خود اعتمادی نے روس اور چین کو متنبہ کر دیا ہے جن کے مفادات امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے ٹکراتے ہیں اس لیے فریقین کی پالیسیاں ایک دوسرے کے رد عمل میں سامنے آتی ہیں۔ عراق اور لیبیا کے عدم استحکام اور طوائف الملوکی کے بعد روس شام کی حکومت بچانے کے لیے بالآخر آگے آیا ہے۔ یہود مسلم تعلقات میں روسی دلچسپی کو اسرائیلی عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ماسکو اپنے قومی سلامتی کے مفادات علاقائی فنکاروں سے مل کر بخوبی پورے کر رہا ہے جس سے روسی قوت اور اثرات خطے میں بتدریج بڑھ رہے ہیں جو مغرب کے مقاصد کی سہولت یا تخریب کی بجائے مساویانہ درجے پر آ گئے ہیں۔[3]

مشرق وسطیٰ سے توانائی کے حصول اور بین البراعظم شاہراہ ریشم کی خاطر چین علاقے کو پر امن دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے سفارتی ذریعے سے اس نے یہود مسلم تعلقات میں بہتری کے لیے چار نکاتی حل پیش کیا ہے جس میں سب سے اہم بات 1967ء کی سرحدوں کے مطابق دو ریاستی حل ہے جس میں مشرقی بیت المقدس فلسطینی

---

[1]-Bard, Mitchell G. Arab-Israeli Conflict, American-Israeli Cooperative Enterprise, USA, p269

[2]-لیوس، برنارڈ، اسلام کا بحران، ترجمہ محمد احسن بٹ، لاہور، نگارشات پبلشرز، 2003ء، ص80

[3]-Friedman, Brandon, Russian involvement in Syria Geopolitics of the Middle East, Tel Aviv University , Moshe Dayan Center for Middle Eastern and African Studies, 2018, p1

ریاست کا دارالحکومت ہو۔[1] ایسا کوئی بھی حل صہیونیوں کے عزائم میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے اس لیے بیجنگ تل ابیب مذاکرات کے جتنے بھی دور ہو جائیں اسرائیل امریکی پشت پیچھے چھپ کر انہیں ناکام بنادے گا۔

صہیونی عزائم کی مخالفت کو سامیت دشمنی سے منسلک کرنا

یہودی دینداری سے مسلمانوں کو دشمنی نہیں ہے۔ مغرب نے فساد کی جڑ کو اپنے ہاں سے اکھیڑ کے فلسطین کے باغ میں لگا دیا ہے جس سے دونوں ادیان کے نام لیوا میدان جنگ میں صف بندی پر اتر آئے ہیں۔ ایسے میں بھی معتدل اور متشدد یہودی نقطہ ہائے نظر کی درجہ بندی کی جانی چاہیے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کو حاصل ویٹو کے حق سے بعض اوقات انصاف پر مبنی اقوام متحدہ کی قراردادیں سرد خانے میں پڑی رہ جاتی ہیں، جیسے اعلان بالفور کی صد سالہ یہودی خوشیوں کو دوچند کرنے کے لیے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے یروشلم کو اسرائیلی دارالحکومت تسلیم کر کے اپنا سفارت خانہ وہاں منتقل کرنے کی سرکاری پالیسی کا اعلان کیا ہے جس سے عالم اسلام میں آمدہ حالات کی سنگینی کا احساس بڑھ رہا ہے۔ نوم چومسکی جنیوا کنونشن کے اعلامیے کے بارے میں امریکی رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "عالمی اعلامیے کی مشہور شق (2) 13 ہے کہ۔"ہر شخص کو کوئی بھی ملک چھوڑنے کا اختیار ہے، بشمول اس کے اپنے ملک کے۔" ہر سال دس دسمبر کو حقوق انسانی کے دن سوویت یونین کی مخاصمانہ مذمت کی جاتی ہے کہ وہ یہودیوں کو ملک چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگلے نظر انداز کردہ جملے "اور اسے اپنے ملک واپس آنے کا بھی حق ہو گا" کی اہمیت 11 دسمبر 1948ء کو یعنی عالمی اعلامیے کی منظوری کے اگلے ہی روز اجاگر ہوئی جب جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر قرارداد 194 منظور کی جس کے تحت فلسطینیوں کے اپنے گھروں کو واپسی، اور اگر وہ نہ آنا چاہیں تو، زر تلافی کی وصولی کے حق کی توثیق کی گئی۔"[2]

بنی حام و یافث کی بنی سام سے رقابت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں جاری رہ کے سامیت دشمنی کی اصطلاح بن گئی۔ یہود نے یہ ہائی جیک کر کے اپنے ساتھ مخصوص کرالی اور اسے اپنی نشاۃ ثانیہ کے صہیونی عزائم تک توسیع دے دی اور اب دیدہ دلیری سے اسے دیگر سامی ادیان کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا

---

[1]-Keinon, Herb, The Jerusalem post, Aug 2, 2017

[2]- چومسکی، نوم، دہشت گردی کی ثقافت، ترجمہ سید کاشف رضا، کراچی، شہرزاد، 2003ء، ص:169

ہے۔ برطانیہ میں سامیت دشمنی اور صہیونیت دشمنی کی اصطلاحات کے باہمی ربط اور یکسانیت پر سوال اٹھ رہے ہیں اور باور کر لیا گیا ہے کہ سامیت دشمنی یہودی عوام سے متعلق مائل بتعصب جارحیت ہے۔ صہیونیت مشرق وسطیٰ میں یہودی ریاست بنانے کی تحریک ہے جو تاریخی اسرائیل سے مشابہت کا اندازے سے حوالہ دیتی ہے اور جدید اسرائیلی ریاست کی مدد کرتی ہے۔ صہیونیت مخالف اسے سامیت دشمنی کہنے سے اختلاف کرتے ہیں۔[1] امریکی دانشور نوم چومسکی کی طرح کئی یہودی صہیونی عزائم سے وابستگی نہیں رکھتے۔ ایشکنازی یہود میں نیٹوری کارٹا جیسی صہیونیت مخالف عالمی تنظیم موجود ہے۔ دنیا کا منہ زور سماجی اور سیاسی مسئلہ فلسطینی تنازعہ ہے جس کے بارے میں صہیونیت مخالف یہودی حاخام آمنون اسحاق غیر مقلدانہ مذہبی رائے رکھتے ہوئے یہود کو روادار رویے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تمام صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اب یہودی حکومت ایریل شیرون سے ہوتی ہوئی بنیامین نیتن یاہو جیسے انتہاپسندوں کے ہاتھوں میں ہے جو اسرائیلی خلافت ارضی کے ابدی حق پر یقین کی وجہ سے یہود مسلم تعلقات میں مساوات کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے پیشرو اسحٰق رابن کو قومی غدار کے طور پر قتل کر دیا گیا تھا جو بتدریج شدت پسندی سے امن پسند رہنما بن رہے تھے۔

صہیونیوں کے حق میں الہامی روایات کی مغربی تشریحات

لادین اور روشن خیال مغربی تہذیب کے بنیاد پرست پالیسی سازوں کو سامی ادیان میں مسیح موعود کی الہامی روایات کی اصلاح پسند تشریحات سے صہیونی عزائم کی پشتیبانی میں حوصلہ افزائی ملتی ہے جن کا دائرہ امام مہدی اور دجال کی آخر الزماں کی علامات تک پھیل گیا ہے۔ قرآن کریم میں اہل کتاب کی وحی میں ملاوٹ کا پردہ چاک کیا گیا اور تحریف کرنے والے مذہبی پیشواؤں کی اندھا دھند باتیں ماننے کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے امریکی مائیکل سکالر Richard Friedman کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اسرائیلیوں نے کئی مواقع پر مختلف ورژن میں از سر نو تورات لکھ کے بد عنوانی کی تھی۔[2] تاہم مغربی عوام کو من عند اللہ کہہ کے ابھی بھی دھوکے میں رکھا جا رہا ہے کہ آخری زمانے میں مسلمانوں کے مسیحا، مہدی کی آمد متوقع ہے جو بائبل میں بیان کردہ اینٹی کرائسٹ سے یکسانیت رکھتا ہے۔ وہ یہود و نصاریٰ سے جنگ کرے گا، یروشلم فتح کرے گا اور اس کا حکومتی دورانیہ سات سال ہو گا۔ انہیں حیرانی ہے کہ مسلم معلم مسیح علیہ السلام کو مہدی کی طرح بتاتے ہیں جو مہدی کی اقتداء میں سب کو دائرہ اسلام میں لائے گا۔ بائبلی معیار

---

[1] What's the difference between anti-Semitism and anti-Zionism? BBC News Magazine, 29th April 2016.

[2] Friedman, Richard, Who Wrote the Bible? New York: Harper and Row, 1989

کے مطابق انہیں ایسا یسوع، جھوٹا نبی دکھائی دیتا ہے جو اینٹی کرائسٹ کے ساتھ ہو کے بہتوں کو شکست دے گا۔[1]

مسیحی شارحین ہر بشارت کو اپنے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ جیسے حجی نبی نے یہوداہ کے ناظم زُربابل سے فرمایا تھا کہ کائناتی شکستگی سے پہلے سلطنتوں کے تخت الٹ دیے جائیں گے، قوموں کی سلطانی کی قوت نابود کر دی جائے گی، سواروں سمیت رتھ الٹ دیے جائیں گے، گھوڑے اپنے شاہسواروں سمیت گر پڑیں گے اور بھائی کی تلوار سے بھائی کا قتل ہو گا۔[2] بائبلی مفسر اسے مسیحی اولیاء کی یہ متوقع کرامت سمجھتے تھے لیکن پاسٹر رسل اس بشارت کو جرمن، فرانسیسی، انگریزی، روسی یا امریکی فوج میں تلاش کرتے ہیں جو فن حرب سے آراستہ اعلیٰ درجے کی نظم وضبط والی فوج ہے اور الوہی فضل سے بادشاہت کے کانٹے کو نہ صرف اٹھا پھینکے گی بلکہ اقوام کی شاہانہ جمعیت کا استیصال کر دے گی کیونکہ فصل کی کٹائی میں اب چند ایام ہی رہتے ہیں۔ بائبلی شجرہ نسب کی تفسیر میں ان کا مؤقف ہے کہ بنی یافث کو یورپ کے حقیقی آباد کار فرض کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے کہ یاجوج ماجوج کے لشکر کے بارے میں ہماری شناخت اتنی مثبت نہ ہو۔[3]

اصلاح شدہ یافثی پروٹسٹنٹ میں علم آخر الزمان کے بائبلی ماہرین ویٹی کن اور پوپ کو مذہبی دلائل اور 666 کے ہندسی علم کے چکر میں لا کے اینٹی کرائسٹ کہتے ہیں۔ مذہبی تعصب کی طرح خطے کی رقابت میں ایسا ہی امریکی اور یورپی مفکرین کا ایک دوسرے کے بارے میں کہنا ہے۔ ڈاکٹر سفر الحوالی لکھتے ہیں کہ تثلیث نے مسیحیوں کے عقائد اور عقول کو بہت متاثر کیا ہے۔ وہ من مانی سے بائبل کی تشریح کرتے ہیں جو یوں ہونی چاہئے کہ استعمار کے متعدد سینگوں میں سے چھوٹا سینگ اسرائیل ہے جو سرزمین مقدس کو پلید کرنے آیا ہے۔ صہیونیت یہودی اور نصرانی دو چہروں والا درندہ ہے۔ یہودی خاص کر صہیونی دور حاضر میں الحاد اور فساد کے داعی بن کے اٹھے ہیں۔ ان کا یروشلم پر قبضہ بربادی کے منحوس خیمے کی تنصیب ہے۔ اژدھا نما سلطنت روما گویا مغرب ہے جو اپنا اختیار اس درندے کو دے گا اور ان دونوں کا خدائی غضب کے دن خاتمہ کر دیا جائے گا۔

ڈاکٹر سفر الحوالی مختلف مسیحی مکاتب فکر کے تصور آخر الزمان بیان کرتے ہیں۔ آپ قیام اسرائیل سے پہلے یعنی انیسویں صدی کے ایک مسیحی مفسر Bates کا ایک قول بیان کرتے ہیں کہ مغربی یورپ

---

[1]- Lavender, Enoch, Rebuilding the temple, 2018, p33

[2]- حجی نبی 22:2

[3]-Russell, Paster, The Battle of Armageddon, Brooklyn, New Yark, 1897, p162

میں تہذیب، آزادی، روشن خیالی اور ترقی کے انسانی اصولوں کے اشتراک عمل کا نتیجہ منتخب سرزمین میں دابۃ الارض (Beast) کی حکومت کا قیام ہے جو ظلم، استبداد، الم اور خدا کی گستاخی کا سنگم ہے ۔ آپ مذکورہ مسیحی مفسر کی ایک کتاب کا بار بار حوالہ دے کے اس پر علمی بحث کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اس بحث کو سمیٹتے ہیں۔[1]

ہماری رائے یہ ہے کہ اہل کتاب کے آخری نبی ﷺ کو نہ ماننے کی وجہ سے سابقہ کتب اور ان کی تشریحات اسلامی مصادر کی آخری الہامی روشنی کے بغیر محض متشابہات ہیں۔ جہاں کہیں سابقہ منتخب امت یعنی بنو اسرائیل کے حق میں بشارت ملے وہاں بلا تخصیص اہل ایمان کو رکھ کے دیکھا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرحد کی ایک جانب نفاق، بدامنی اور تخریب کاری کرا کے دوسری طرف چین کی نیند سونے کا حل آسمانی گرفت کی صورت میں سامنے آئے گا۔ تب تک اصحاب کہف کی مانند پہاڑ ایمان بچانے کے مورچے ہیں جن سے مسلمان غفلت کر کے باہم دست بگریباں ہیں۔ اسی طرح سب سے بڑے یعنی دجال کے فتنے سے بچنے کے لیے سورہ کہف کی ابتدائی آیات کی تلاوت کا نبوی حکم ہے۔ جس میں مسلمانوں کو بشارت جبکہ مسیحیوں کو ابنیت مسیح، لاعلمی، جاہلانہ ورلڈ آرڈر اور جھوٹ کی وجہ سے خوفناک تنبیہ کی گئی ہے۔

مغربی تہذیب کے علمبرداروں اور صہیونیوں کو قرآنی مہلت سے فائدہ اٹھا کر فساد سے احتراز کرنا چاہیے قبل اس سے کہ باب لُد پر جھوٹا مسیح سچے مسیح کے نیزے کا شکار ہو۔ اہل کتاب شبہے کا شکار ہوئے تھے اب مظلوموں کا مسیحا راج کرتا دیکھ کے یاجوج ماجوج یہود کے ہاتھوں اسے مصلوب کرنے کی تاریخ دہرانا چاہیں گے۔ جس معبود نے اصحاب کہف کو چھپائے رکھا ہے وہ قادر ہے کہ اپنے نبی کو آسمان پر لے جانے کی بجائے دوسری بار مشرق وسطی کے پہاڑ پر چھپا دے۔ آسمانوں پر تیر برسانے والے مسیح علیہ السلام کی بددعا سے ہلاک کر دیئے جائیں گے جن کے ہتھیار مال غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ لگیں گے جن پر اس سے پہلے ہمیشہ دوسروں کو ترجیح دی گئی تھی۔ یہ ہتھیار نجات پانے والوں کے لیے ایک طویل عرصے تک ایندھن کا کام دیں گے۔

جمی کارٹر سیکولر امریکہ کی مشرق وسطیٰ میں پالیسی پر کچھ مسیحی بنیاد پرستوں اور ان کے نظریات کے بھرپور اثر پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے مذہب اور حکومت کا عجیب امتزاج دیکھتے ہیں۔ جنہیں بائبل کی پیشگوئی پوری کرنے کے لیے یقین ہے کہ Rapture (نزول مسیح کا پر مسرت

---

[1] – الحوالی، ڈاکٹر سفر بن عبد الرحمٰن، روز غضب، ترجمہ حامد کمال الدین، مطبوعات ایقاظ، لاہور، س ن، ص:123، 129

لمحہ) کی جلد آمد ان کی شخصی ذمہ داری ہے۔ جن کے ایجنڈے میں مشرق وسطیٰ میں اسلام کے خلاف جنگ کرنا اور یہودیوں کا ساری ارض مقدس کو چھین لینا شامل ہے جہاں سے مسیحیوں سمیت تمام غیر یہودیوں کو نکال دیا جائے گا۔ پھر کافر (Anti-Christ) اس علاقے کو فتح کر لیں گے اور مسیح آخری فتح پائے گا۔ انہیں حیرانی ہے کہ چند اسرائیلی لیڈروں نے یہودیوں کی آخری مصیبت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس امداد کو قبول کر لیا ہے۔[1]

مغربی و صہیونی تلبیس اسلامی علم آخر الزماں کی تحقیقات کی عصری ضرورت و اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ اسی لیے شیخ عمران حسین بجا کہتے ہیں کہ صہیونی مسلسل تحریف شدہ متون کے حوالے دیتے ہیں اور حلت و حرمت اپنے ہاتھ میں لے کے سیاسی و معاشی شرک میں مبتلاء ہیں۔ وہ نیل سے فرات کے پانیوں تک اسرائیل بنانے کے لیے یہودیوں کے جذبات ابھارتے ہیں جس کا دارالحکومت یروشلم ہو۔ شرلاک ہومز اور جیمز بانڈ کے جھوٹے کردار دکھانے والی مغربی تہذیب کی اولیں عالمی سپر پاور برطانیہ نے لارنس آف عریبیہ سے دجالی جساسہ[2] کا کام لیا جس سے عرب دھوکہ کھا گئے۔ قادیانی متنبیت اور تحریک نسواں اسی تہذیب کے دوسرے جھانسے ہیں۔

اس تہذیب کی دوسری عالمی سپر پاور، امریکہ صہیونی استیصال میں شریک ہے جس سے تمام عربوں کی آزمائش بڑھ گئی ہے۔ اسرائیل گلیلی کا پانی فطری آمد سے زیادہ خرچ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ خطے کو اپنے پلانٹوں سے صاف کردہ پانی کا محتاج بنائے اور یوں عرب اسے اور اس کے معبود دجال کو مان لیں۔ صلیبی جنگجوؤں کی طرح مادہ پرست یہودیوں کو ارض مقدس سے کیا لگاؤ ہے؟ مستقبل میں امریکہ کی کاغذی کرنسی کو ناکام کر کے وہ خود یروشلم سے دنیا پر حکومت کریں گے۔ اپنی دینی بدعنوانی اور قلبی اندھاپن کی وہ الوہی وعید کے مطابق سزا

---

[1]- کارٹر، جمی، امریکہ کا اخلاقی بحران، 2006ء، ترجمہ محمد احسن بٹ، لاہور، دارالشعور، 2006ء، ص112

[2]- حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت ہے کہ حضرت تمیم داری اور ان کے ہمرکاب کشتی سواروں کو بحکم الٰہی طویل سمندری طوفان کے ذریعے ایک ماہ کی مسافت سے ایک جزیرے کے ساحل پر پہنچا دیا گیا جہاں دیوہیکل دجال مقید تھا۔ انہیں ساحل پر دجال کی جساسہ سے سابقہ پڑا جس کے جسم پر بال تھے اور اس کے آگے پیچھے کی اور صنفی شناخت بہت مشکل تھی۔ عند الملاقات دجال نے نبی اکرم ﷺ پر عربوں کے ایمان لانے کو ان کے حق میں بہتر بتایا اور دیگر علامات کے علاوہ بحیرہ طبریہ کی خشکی کو اپنے خروج کی علامت بتایا۔ (صحیح مسلم، ترجمان السنۃ، 114:4)

پائیں گے اور اپنے دجالی معبد سمیت زمیں بوس ہو جائیں گئے۔[1]

تہذیبی تصادم کے خدشات کا سدباب

سیمویئل پی ہنٹنگٹن دنیا کی بڑی تہذیبوں کے درمیان عالمی جنگ کا اندیشہ رکھتے ہیں جو ان کے مابین تقسیمی خط کی جنگ سے شروع ہو سکتی ہے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ایک طرف مسلم ہوں گے اور دوسری طرف غیر مسلم کیونکہ مسلمانوں کی مرکزی ریاستیں اپنے ہم مذہبوں کو مدد فراہم کریں گی۔[2] مغربی دانشور کو مظلوموں کی عالمی حمایت کی بات کرنا چاہیے تھی تاکہ صف بندی کا موقع نہ آئے۔ انہوں نے امت مسلمہ کی طاقتوں کے لیے مرکزی ریاستوں کی اصطلاح بیان کی ہے جو جنگ ہائے عظیم میں اتحادیوں کا مقابلے پر شکست کھانے والوں کے لیے کہی جاتی ہے۔ اس طرح کی تقسیمی خطوط کی مہربانی نو آبادیاتی نظام نے جاتے جاتے مغربی تصور ملت کے تحت کی تھی جسے اسرائیلی مفادات کے مطابق پھر سے سدھارنے میں امریکہ مگن ہے جب کہ خود مغرب تقسیمی خطوط مٹا کے متحدہ یورپ بنا رہا ہے۔

یہود مسلم تعلقات کی کشیدگی سے مشرق وسطیٰ آتش فشاں کا دہانہ دکھائی دیتا ہے جس سے لاوہ پھٹ پڑنے سے پہلے بچاؤ کی تدابیر کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ایک چنگاری بھڑک کر پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دور بیٹھ کر الاؤ کی تپش لینے والے امن عالم کے ٹھیکیدار بانسری بجانے والے نیرو بن جائیں یا ہنوز دلی دور است کہتے مدہوش ہی نہ رہ جائیں اور صہیونی، بھارتی، سربی یا برمی آگ سب کچھ جلا کر راکھ کر دے۔

اسرائیل کی دیدہ دلیری عراق و شام کے ایٹمی پروگراموں کی تباہی ہے۔ اسرائیلی نیوکلیائی صلاحیت کے رد عمل میں شمالی کوریا کے تعاون سے شام خفیہ تحقیقی ری ایکٹر پر کام کر رہا تھا کہ ستمبر 2007ء میں اسرائیلی ہوائی شب خون کام دکھا گیا۔ کئی عرب ریاستیں سائنسی اور صنعتی ڈھانچے اور ماہرین کے انسانی سرمایہ کی عدم موجودگی کے باوجود بطور کریش پروگرام نیوکلیئر پروگرام کا قیام چاہتی ہیں۔[3] اسرائیل کے اپنے ہمسایوں سے تعلقات کی نوعیت شروع سے بہت حساس ہے۔ گولان شام کے پاس تھا جبکہ مغربی کنارہ اردن کے۔ اسی طرح غزہ کی پٹی اور صحرائے سینا کا کنٹرول مصر سنبھالے ہوئے تھا کہ 5 جون 1967ء کو اسرائیل نے حملہ کر دیا۔ اس نے عرب

---

[1]-Hosein, Imran N. Jerusalem in the Qur'an, Masjid Dar al Qur'an, Long Island, New York, 2003 P142

[2]۔ ہنٹنگٹن، سیموئیل پی، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ محمد احسن بٹ، لاہور، مثال پبلشنگ، 2003ء، ص368

[3]- Riedel, Bruce & Gary, Samore, Managing Nuclear Proliferation in the Middle East, Brookings institute, 2005,p96

فوجوں کو چھے دنوں میں کھوکھلا کر دیا اور دو بلین ڈالر کے مصری عسکری ساز و سامان کو تباہ کر دیا۔[1]

امریکی اشیر باد سے اسرائیل ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط تر ہو رہا ہے اور اس کے ہمسائے کمزور۔ نیز مشرق وسطیٰ عالمی طاقتوں کی پراکسی جنگ کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ پہلے بھی 1956ء کی سویز جنگ میں فرانس اور برطانیہ کی عالمی طاقتیں اپنے نو آبادیاتی دور کے چلے آرہے مفادات کے تحفظ میں اسرائیل کے شانہ بشانہ تھیں۔ کیرن آرمسٹرانگ عالمی طاقتوں کی حکمت عملی کے یہود مسلم تعلقات پر اثرات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "اسرائیل مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی کلائنٹ ریاست نہیں رہا بلکہ وہ وہاں امریکی پالیسی کا تعین کرنے لگا۔ اس سپر پاور کی پشت پناہی سے اسرائیل عرب حملے سے محفوظ ہو گیا۔ امریکہ نے اسے فوجی اعتبار سے تمام عرب ریاستوں سے زیادہ طاقتور بنانے کا عہد کیا۔ برطانیہ اور فرانس کا اثر ختم ہو جانے کے بعد مشرق وسطیٰ میں ان کی جگہ امریکہ نے لے لی تھی۔"[2]

تہذیبی تصادم کے عالمی منظر نامے میں بین الادیان منفی رجحانات میں کمی کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ تصادم کی ہنگامی حالت سے بچنے کے لیے اور تعلقات میں عادلانہ پیشرفت و بہتری کے لیے نبی کریم ﷺ نے وحدانیت کی مشترکات پر توجہ مرکوز رکھنے کا الوہی پیغام دیا ہے کہ اے اہل کتاب تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو رب نہیں بنائے گا۔[3]

1- Oren, Michael B. Six Days of War: June 1967 and the making of the Modern Middle East, New York:Oxford University Press, 2002, p 305

2- آرمسٹرانگ، کیرن، مقدس جنگ، ترجمہ محمد احسن بٹ، لاہور، نگارشات پبلشرز، 2006ء، ص149

3- آل عمران 64:3

پاکستان کی نظریاتی اساس کے تقاضے اور موجودہ نصاب تعلیم

ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

خدیجہ اکبر خان*

ڈاکٹر حافظ انس نضر**

ABSTRACT

Pakistan is an Islamic country. The ideological basis of a Pakistan plays the vital role in the protection and progress of the country which has some particular needs for which the government manage all of the sources and resources and it also train the new generation to enable them to protect the ideological basis of the Pakistan where the curriculum can play the vital role.

It is very important to analyses that what are the particular needs of the ideological basis of the Pakistan and how the educational curriculum can protect and develop the ideological basis of Pakistan?

The objective of the study is to analyses the curriculum of Pakistan whether it meets the needs of the ideological basis of the Pakistan or not?

This study will be very helpful for the whole community but especially for the curriculum development committees, students and teacher who can understand the important role of the curriculum development to meet the needs of the ideological basis of the Pakistan.

KEYWORD: تعلیم، نصاب، نظریاتی اساس، اسلامی نظریۂ حیات، دستور پاکستان

* پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور

ملک و قوم مخصوص نظریات کی بنا پر وجود میں آتی ہیں اور ان کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں جن کے حصول کے لیے آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایسا نصابِ تعلیم تشکیل دیا جاتا ہے جس سے ان تقاضوں کے حصول کو ممکن بنایا جا سکے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کی بحیثیتِ اسلامی ریاست نظریاتی اساس کیا ہے؟ اس نظریاتی اساس کے کیا کیا تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کے حصول کے لیے کون کون سے اقدامات کرنا ضروری ہے؟ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم پاکستان کی اس نظریاتی اساس کے تقاضوں کے حصول کے لیے کس حد تک موثر ہے؟؟ اور اس میں کیا تبدیلیاں کرنا ضروری ہیں؟؟

اس تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ نصابِ تعلیم کا جائزہ لیا جائے اور اس کا تجزیہ کیا جائے کہ کیا ہمارا نصابِ تعلیم پاکستان کی نظریاتی اساس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟

اس تحقیق سے نصاب سازی کرنے والی کمیٹیوں کو رہنمائی حاصل ہو گی اور وہ نظریاتی اساس کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نصابِ تعلیم میں تبدیلیاں یا ترمیم کر سکیں گے اور نصابِ تعلیم کے معیار اور کوالٹی کو بلند کر سکیں گے۔

اس تحقیق میں پاکستان کی نظریاتی اساس اور اس کے تقاضوں کو زیرِ بحث لایا جائے گا اور موجودہ نصابِ تعلیم پر اس انداز سے بحث کی جائے گی کہ آیا وہ اس نظریاتی اساس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔

پاکستان کی نظریاتی اساس

پاکستان کی نظریاتی اساس کا قیام دینِ اسلام پر ہے اور دینِ اسلام پاکستان کے مسلمانوں کو ایک ایسا ضابطۂ حیات فراہم کرتا ہے جو افراد کی دینی اور دنیاوی کامیابی کی ضمانت اور پاکستان کی نظریاتی اساس کا مکمل تحفظ ہے لیکن اسلامی نظریۂ حیات کے تحفظ کے لیے دینِ اسلام ہی سیاسی تنظیم یعنی پاکستان کے قیام کے ساتھ ساتھ اس کے استحکام اور دفاع کو ضروری سمجھتا ہے کیونکہ کوئی نظریاتی اساس کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس وقت تک بیکار ہے جب تک اس پر مضبوط عمارت نہ کھڑی کی جائے اور جب اس عمارت میں رہنے والے اس نظریۂ حیات پر عمل کرنے والے اور ایمان رکھنے والے افراد موجود ہوں، اس کے لیے مل جل کر کام کرنے کا ارادہ ان میں کار فرما ہو اور یہ افراد اپنے ارادے، ایمان اور عمل کرنے کے جذبہ پر جتنا زیادہ پختہ ہوں گے تو ان کی زندگی کا سفر بھی بہتر

انداز سے طے ہو گا،[1] یہی نظریۂ حیات افراد کے ساتھ ساتھ پاکستان کو اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کرنے کا حکم بھی دیتا ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے افراد کو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرائے اور ان کے درمیان اسلامی اقدار اور ثقافت کی نشوونما کرے[2]، اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾[3]

"دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے)۔ یہ خدا رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔"

انسانی اجتماعیت جب اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس نظریۂ حیات کو اپنا لیتی ہے تو زندگی کے ہر میدان میں کامیابی وکامرانی ان کا مقدر بن جاتی ہے، تاریخِ انسانی بھی اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی انسانی اجتماعیت نے وحی الٰہی کی ہدایات کے مطابق اپنی سیرت وکردار کی تشکیل وتعمیر میں غفلت، لاپرواہی اور بے نیازی اختیار کی تو تباہی ان کا مقدر بن گئی اور آج بھی انسانی زندگی کی ہولناکیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے: انسان کا اپنے خالق کے عطا کردہ نظریۂ حیات سے بغاوت کرتے ہوئے خود ساختہ نظریۂ حیات میں انسانی راحت کی تلاش میں ہے جو انسانیت کو تباہی کی جانب دھکیلتی چلی جاتی ہے جس کی مثالیں ہمیں تاریخ سے ملتی ہیں جیسے دونوں جنگِ عظیم کے علاوہ فلسطین، بوسنیا، افغانستان، عراق، ایران، کشمیر اور برما کی ہولناک صورتحال اور نتائج سب کے سامنے ہیں۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کی کئی صدیوں پر محیط تحقیقات نے یہی ثابت کیا ہے کہ ماضی میں جتنی بھی قومیں گزری ہیں وہ قومیں صرف اپنی نظریاتی استحکام کی بنیاد پر قائم تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے پاس مادی وسائل بھی وافر مقدار میں موجود تھے لیکن ان وسائل کے ساتھ ساتھ ان کا ایک مخصوص نظریۂ حیات تھا جس کے استحکام اور دوام میں ان کے مذاہب نے بڑا اہم کردار ادا کیا، یہی مخصوص نظریۂ حیات ان کی پہچان

---

[1] ۔ نعیم صدیقی، تعلیم کا تہذیبی نظریہ، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، مئی 2009ء: ص58

[2] ۔ قریشی، ایم اے، پاکستان میں تعلیم کے تناظر، مجید بک ڈپو، لاہور، 1978ء: ص271

[3] ۔ الاعراف 54:7

بھی تھا اور ان کی بقا کا ذریعہ بھی تھا کیونکہ وہ اس نظریۂ حیات کے تحفظ کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور تاریخ گواہ ہے کہ جس دن انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کو نظر انداز کر دیا اس دن ان کا زوال ان کا مقدر بن گیا اور اسی ہٹ دھرمی میں نہ صرف وہ معدوم ہو گئیں بلکہ ان کا نظریۂ حیات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور آج ان کا نام لینے والا بھی باقی نہیں۔

یہ نظریہ ہی تو ہے جو انسان کو ہم آہنگ اور یکسو کرتا ہے، افراد کو باہم اتحاد و یکجہتی سے مالا مال اور اعلیٰ اخلاق سے مزین کر کے اشرف المخلوقات کے عہدے پر فائز کرتا ہے اور ان افراد کی اصلاح کے ذریعہ معاشرے کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے اور ریاست کو ضابطۂ حکومت بھی فراہم کرتا ہے۔[1] کوئی ملک جب کسی مخصوص نظریۂ حیات کو اپناتا ہے اور وہ نظریۂ حیات ایک طویل عرصہ تک اس ملک کے تمام افراد کی عادات میں شامل ہو جاتا ہے تو دوسرے ممالک اور قوموں کے درمیان یہ نظریۂ حیات اس ملک کی نظریاتی پہچان بن جاتا ہے اور جب تک یہ ملک اپنے نظریۂ حیات کی بقا، تحفظ، نشوونما اور ترویج واشاعت کے لیے نمایاں اقدامات کرتا رہے گا اور اس کے افراد اس پر عمل درآمد کرتے رہیں گے دوسرے ملکوں کے درمیان میں اس ملک کی نظریاتی پوزیشن مضبوط ہوتی چلی جائے گی جس کی بنیاد پر اس کی ساکھ مضبوط ہوتی چلی جائے گی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں پر اس ملک کا ایک رعب و دبدبہ قائم ہو جاتا ہے جس سے اسے نہ صرف مادی ترقی نصیب ہوتی ہے بلکہ اس کا دفاع بھی مضبوط ہوتا ہے۔

دینِ اسلام کو خالق و مالک نے انسانی رہنمائی کے لیے بہترین شکل میں، عملی ثبوت اور عملی نمونہ کے طور پر نبی کریم ﷺ کے ذریعہ مکمل کیا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ایسی عظیم ہستی بنا کر بھیجا کہ آپ ﷺ نے چند سالوں میں پوری دنیا کے سامنے مسلمانوں کی ایک مضبوط اور مستحکم نظریاتی پوزیشن قائم کر دی، آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین نے آپ ﷺ کی تعمیر کی ہوئی بنیادوں پر ملتِ اسلامیہ کی نظریاتی پوزیشن کو مزید مستحکم کرنے اور اس کی ترویج واشاعت کا کام تیس سال تک جاری وساری رکھا جو مزید ایک ہزار سال تک درخشاں اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد بنی، ان ادوار میں اسلامی حکومتوں کے اتار چڑھاؤ بھی ہوتے رہے لیکن ان اتار

---

[1] علوی، مستفیض احمد، مغربی جمہوریت۔ حقیقت اور سراب، بہ اشتراک ادارہ نور سحر و بیت الحکمت، لاہور، 2003ء: ص8

چڑھاؤ سے ایک بات اور ثابت ہو گئی کہ جو بھی اسلامی حکومت اپنی نظریاتی بنیادوں کی مضبوطی اور تحفظ کے لیے دینِ اسلام کا عطا کردہ باقاعدہ ضابطۂ حکومت اپناتی رہی وہ عروج کا سفر طے کرتی رہی اور جس نے اس سے انحراف کیا وہ بکھرتی چلی گئی۔[1]

پاکستان بھی اسی نظریۂ اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اور اسلام ایک ایسی عالمگیر طاقت ہے جو پاکستانی عوام کو ایک نقطہ پر لا کھڑا کرتی ہے اور ان میں محبت، یگانگت اور اتحاد کا رشتہ استوار کرتی ہے اور موجودہ حالات جس ڈگر پر جا رہے ہیں ان میں پاکستان کا تحفظ اور استحکام انتہائی ضروری ہے تاکہ پاکستان ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رہ سکے اور دنیا کی دوسری بڑی طاقتور قوموں کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر سکے لیکن پاکستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عوام اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں،[2] پاکستان کو اسلام کا قلعہ بھی کہا جاتا ہے اور اس قلعہ کی حفاظت انتہائی ضروری ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ پاکستان جس نظریہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا وہ نظریہ آج بھی موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے اور آج ہر پاکستانی اپنے وطنِ عزیز کے دفاع کے لیے کسی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتا لیکن یہی جذبہ یہی ایثار آنے والی ہر نسل میں بھی سرایت کرانا ضروری ہے تاکہ پاکستان دینِ اسلام کے قلعہ کی ترجمانی کرتے ہوئے قیامت تک اس دنیا کے نقشہ پر قائم دائم رہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم پاکستان کی نئی نسل کو اس نظریہ حیات کا عادی بنائیں گے اور اس کے تحفظ کے لیے انھیں تیار کریں گے اور انھیں باخبر رکھیں گے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس کیا ہے؟ اور اس کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ تاکہ انھیں بھی اندازہ ہو سکے کہ آج پوری دنیا میں پاکستان کی جو حیثیت اور مقام ہے اس میں پاکستان کی نظریاتی اساس کا قلیدی کردار ہے وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بحیثیتِ مسلمان اور بحیثیتِ پاکستانی انھیں پاکستان کی نظریاتی اساس کے تحفظ اور بقا کے لیے کیا کردار ادا کرنا؟[3]

---

[1]۔ مغربی جمہوریت۔ حقیقت اور سراب: ص9

[2]۔ پاکستان میں تعلیم کے تناظر: ص264

[3]۔ عیسی خان، محمد، تعلیمی فلسفہ اور تاریخ، علمی کتاب خانہ، لاہور، 1996ء: ص244

پاکستان کی نظریاتی اساس اور تحریکِ پاکستان

قیام پاکستان کے لیے جب تحریک کا آغاز کیا تو ان کے ہاتھوں میں صرف نظریۂ اسلام کی مشعل تھی جس سے تصورِ پاکستان کی چنگاڑی پھوٹی جس نے بر صغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو گرما دیا ایک الگ وطن کا بیج بویا جنہوں نے اپنے خون پسینے اور آنسوؤں سے اس نظریہ کی آبیاری کی جس کی بنا پر پاکستان ایک آزاد مملکت کے طور پر نمودار ہوئی اور آج ہم اس نظریاتی اساس (جڑ) کو پاکستان سے کیسے الگ کر سکتے ہیں آج پاکستان ایک تناور درخت کی مانند ہے جس کی ہر شاخ، ہر پتے اور ہر پھول میں نظریۂ اسلام نقشِ تقدیر بن کر ثبت ہے،[1] اور جڑ کے بغیر درخت کا وجود بر قرار نہیں رہ سکتا یہی جڑ (اساس) درخت (پاکستان) کو ایک طرف مضبوطی فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی نشوونما (ترقی و تعمیر) کے لیے اسے خوراک اور پانی بھی فراہم کرتی ہے، قیامِ پاکستان کے بعد اس نظریہ کے تحفظ کی ذمہ داری پہلے سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی کیونکہ بر صغیر پاک و ہند میں پاکستان کا قیام ایک معجزہ سے کم نہیں تھا اور اس وقت مسلمانوں کے سامنے پاکستان ایک جنت کے ٹکڑے کی طرح تھا جہاں اب وہ آزادی سے اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکتے تھے اور ایک ایسے خواب کی تعبیر انہیں مل چکی تھی جس کے لیے لاکھوں مسلمان جانوں کی قربانیاں دے چکے تھے قیامِ پاکستان کے بعد کوششیں ضرور کی گئیں کہ پاکستان کو اس کے نظریہ سے الگ کر دیا جائے اور پاکستان کے ساتھ اس کے اسلامی نظریۂ حیات کو بھی مسخ کر دیا جائے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان جن لوگوں کی قربانیوں سے وجود میں آیا ہے اور ایسے افراد جو آج بھی پاکستان کے لیے اپنی جانوں کی قربانیاں دینے سے گریز نہیں کرتے ان کی بدولت پاکستان تا قیامت دنیا کے نقشہ پر قائم رہے گا اور ترقی کی جانب ہمیشہ سفر جاری رکھے گا (ان شاءاللہ)۔

پاکستان کی نظریاتی اساس کے تقاضے

پاکستان کی نظریاتی اساس کے تقاضے

پاکستان جس نظریہ کی بنیاد پر قائم گیا اس کے تین اہم تقاضے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا

---

[1] ۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص58،59

سکتا: پہلا تقاضا ایک ایسی "ریاست کے قیام کا تصور یا سوچ" ہے جس کی بنیاد نظریۂ اسلام پر ہو اور جس میں اسلامی نظریۂ حیات کو فروغ اور تحفظ حاصل ہو۔ دوسرا اہم تقاضا اس ریاست کو اسلامی ریاست کے پیکر میں تراشنا تھا یعنی اس اسلامی ریاست کے قیام کو عمل میں لانا، لیکن اسلامی ریاست کے قیام کے بعد یہ نظریہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک تیسرا اہم تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کے پیکر میں یہ اسلامی نظریہ روح بن کر عملاً کام کرنے لگے [1]، جو ہر دور میں ترقی کی منازل طے کرتا چلا جائے اور یہ ایک ایسا وطن ہو جس میں مسلمان آزادی سے اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ مسلمان اس وطنِ عزیز میں ایک قوم بن کر رہیں جس میں دینِ اسلام کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے یعنی ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو ریاست میں اسلامی قانون کے نفاذ کو ممکن بنا سکے اور سب سے اہم بات اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا پرچار اور غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کا خاتمہ کر سکے جس مقصد کے تحت اسلامی جمہوریہ پاکستان حاصل کیا گیا۔ دینِ اسلام اتنا حسین اور منفرد نظریۂ حیات فراہم کرتا ہے جس کی بدولت مسلمان سیکڑوں سال ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی ان میں ضم نہ ہو سکے اور اپنے تشخص کو ہمیشہ قائم و دائم رکھا۔

یہی وہ تقاضے تھے جن کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا اور اس کی تخلیق کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ دینِ اسلام پاکستان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا رہنما اصول ہو۔ انہی تقاضوں کی تکمیل کی غرض سے بلاشبہ اس دور کے چند حکمرانوں نے ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنے کی کوششیں بھی کیں [2]۔

قیامِ پاکستان کے نو سال بعد جب 1956ء میں پہلا آئین بنا اور پھر 1973ء میں پاکستان کا موجودہ آئین بنا تو اس میں پاکستان کے نظریاتی تحفظ کا پورا پورا اہتمام کیا گیا تو اس میں بھی ان تقاضوں کے حصول کے لیے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کر دیا گیا کہ پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہو گا، جسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے پکارا جائے گا۔ اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہو گا اور قرار دادِ مقاصد میں دیئے گئے اصولوں اور شقوں کو دستور کا حصہ تسلیم

---

[1] ایضاً: ص58

[2] اسلامی تحریک۔ درپیش چیلنج: ص71

کیا جائے گا۔[1]

کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی پیداوار تھا اور پاکستان بننے کے بعد وہ نظریہ ختم ہو گیا اس لیے ان تقاضوں کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ حالانکہ اگر ہم تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ پاکستان ایک تصور کی پیداوار ہے جس کے دو نکات ہیں ان میں سے "دو قومی نظریہ" اس تصور کا اہم ترین حصہ ہے جب کہ تصورِ پاکستان محض دو قومی نظریہ تک محدود نہ تھا۔ اس تصور کا پہلا حصہ دو قومی نظریہ تھا جو ایک حقیقت ہے کیونکہ صدیوں تک ہندو اور مسلمان اکٹھے رہنے کے باوجود کبھی ایک قوم نہیں بنے، ان کا تشخص ہمیشہ جدا جدا رہا ہے وہ کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکے لیکن اس نظریہ یا سوچ کا واضح انداز میں دوسرا تقاضا یہی تھا کہ اس کے لیے ایک ایسے الگ وطن کا حصول ممکن بنایا جائے جسے "اسلامی اور فلاحی ریاست" بنایا جائے جس میں مسلمان آزادی سے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزار سکیں اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں،[2] اور اپنے نظریہ کو حقیقت کا روپ دے سکیں، وہ ملکی وسائل کے مالک ہوں اور انہیں اپنی ترقی خوشحالی اور بہترین مستقبل کے لیے استعمال کر سکیں،[3] جہاں وہ اپنا اسلامی نظام حکومت اور اسلامی نظام تعلیم واضح کریں اور عالمی سطح پر نام پیدا کر سکیں اور تصورِ پاکستان کا یہ حصہ ابھی تعمیر کے مراحل میں ہے جس کی تکمیل اسلامی نظریۂ حیات کے لیے انتہائی لازم و ملزوم ہے

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا جو محض دو قومی نظریے کی بنیاد پر قیام پاکستان تک محدود نہ تھا بلکہ اسے ایک مخصوص اسلامی ریاست بنانا بھی اس نظریے کا اہم تقاضا تھا۔[4] جس کے لیے اہم اقدامات کرنا بہت ضروری تھے لیکن اس جانب آج تک توجہ نہیں دی گئی۔

---

[1]۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا دستور، ص:2

[2]۔ صفدر محمود، پاکستان کی نظریاتی اساس، استفادہ: 1 جنوری 2018، اشاعت:
http://hilal.gov.pk/index.php/hilal-urdu/item/2758-2017-05-09-08-22-13

[3]۔ پاکستان میں تعلیم کے تناظر، ص:260

[4]۔ اسلامی تحریک۔ درپیش چیلنج، ص:64

پاکستان کی نظریاتی اساس کے تقاضے اور موجودہ نصابِ تعلیم

ایمان کے بعد عمل صالح دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس میں مدد دینے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست اسلامی نظریۂ حیات کو خالص اور بے آمیز طریقہ سے نافذ کرے۔[1] اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست تعلیم وتربیت کا خصوصی نظام ترتیب دے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک نظریات کی ترسیل اور تحفظ کا امین ہو، دین اسلام کے نصب العین، پیغام اور مشن سے مطابقت رکھتا ہو اور اس پیغام کے مخالف فکری واخلاقی رجحانات کو مسترد کر کے خودی، خودداری اور ایجاد واجتہاد کی راہ اختیار کرنے والا ہو۔[2]

نظامِ تعلیم ہی کے ذریعہ نئی نسل کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے ترقی یافتہ دانش مند قومیں اپنے تعلیم وتربیت کے عمل میں مادی تعلیم کے ساتھ ساتھ نظریاتی تعلیم وتربیت کا بھی خصوصی اہتمام رکھتی ہیں۔ نظامِ تعلیم میں بنیادی چیز اس کے طے کردہ مقاصد ہیں جن کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے نصابِ تعلیم مرتب کیا جاتا ہے یعنی نصابِ تعلیم کو مقاصدِ تعلیم کے حصول کا آلہ کار بنایا جاتا ہے۔

نصاب کو انگلش میں کری کیولم (Curriculum) کہا جاتا ہے لفظ کری کیولم کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ "Courier" ہے جس کے معنی ہیں "ہموار راستہ" یعنی ایسا راستہ جس پر چل کر کوئی بھی فرد اپنی منزل مقصود پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاب وہ راستہ ہے جس پر چل کر افراد، اور اقوام یا معاشرے اپنی طے کردہ منزل مقصود پر پہنچتے۔[3]

عربی زبان میں نصاب کا مادہ نصب ہے جس کے معنی علامت اور بلندی کے ہیں،[4] یعنی نصاب فکر انسانی کی بلندی کی علامت ہے اور اس کے ذریعے افراد، اقوام اور معاشرے اپنی زندگی میں بلند مقام حاصل کرتے ہیں۔

---

[1]۔ یوسف القرضاوی, فکری تربیت کے اہم تقاضے, مترجم: سلطان احمد صلاحی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، طبع چہارم، 2006ء ص12، 13

[2]۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص27

[3]۔ شاہد، ایم اے، نصاب سازی اور انسٹرکشن، مجید بک ڈپو، لاہور، س ن، ص27

[4]۔ الافریقی، ابن منظور، أبو الفضل محمد بن مکرم، لسان العرب، دار صادر بیروت الطبعه الثالثه، 1414ھ، 761-759/1

نصابِ تعلیم تدریس کے عمل کی ایک قابل دید پیداوار ہے جو کسی بھی معاشرے میں رائج معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار اور رائج طریقہ کار کا عکاس ہوتا ہے جو محض کتاب نہیں ہوتا بلکہ تعلّم کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے تحریر نہیں کیا جاتا بلکہ تشکیل دیا جاتا ہے۔[1]

عام طور پر کسی بھی تعلیمی ادارے میں پڑھائے جانے والے مضامین اور کورسز کو نصاب کہا جاتا ہے،[2] لیکن مختلف ماہرین تعلیم "نصاب" یا نصاب تعلیم" کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں جس سے نصاب تعلیم کو مختلف حوالوں سے سمجھنے میں مدد ملتی ہیں[3] نصاب کی ایک جامع تعریف کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے:

"نصاب تمام ذہنی، جسمانی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ میں مطلوبہ سیرت و کردار پیدا کرتا ہے۔[4] طلبہ کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے ہوئے ان کی بہترین تعلیم وتربیت کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہ ایک ایسا "ایکشن پلان" ہوتا ہے جو افراد کی تعلیم وتربیت میں رہنمائی فراہم کرتا ہے،[5] جس میں مقاصد کا تعین بھی کیا جاتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے لائحہ عمل بھی دیا جاتا ہے،[6] جو تعلیم، وقت، حالات اور ضرورت کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔[7] بہر حال نصاب کی کوئی محدود تعریف بیان کرنا ایک پیچیدہ اور مشکل عمل ہے۔

نصابِ تعلیم کو تعلیم کا قلب بھی کہا جاتا ہے کیونکہ مقاصدِ تعلیم اگر منزل کی حیثیت رکھتے ہیں تو نصابِ تعلیم

---

[1] -ندیم حسن گوہر، محمد مرتضٰی ملک، ٹیکسٹ بک ڈیویلپمنٹ، مراد علی پبلیکیشنز، لاہور، س ن: ص168

[2] -Oxford dictionary of education.online

[3] - محمد موسیٰ ملک، شازیہ رشید، تدوین نصاب اور تدریس، جدران پبلیکیشنز، لاہور، 2012ء: ص15

[4] - 286.Kerr, J.F. Changing the Curriculum. University of London Press. London, 1968.

[5] - نصاب سازی وانسٹرکشن، ص:32

[6] -Ralph, W.Tyler. Basic Principals of curriculum and Instruction. Forward by peter and Hilcowitch, University of Chicago Press‹. Chicago, 1949:pi

[7] -Walton, J. The Curriculum in the Changing World. Armidale, N.S.W.: University of New England. England,1976:p 6

جادۂ منزل کی حیثیت رکھتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لیے جادۂ منزل سے آگاہی انتہائی ضروری ہے،[1] اور ہماری منزل دینِ اسلام کے مطابق اپنی نئی نسل کی تعلیم وتربیت کرنا ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم ہماری نظریاتی اساس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے یا نہیں؟

قیامِ پاکستان کا سب سے پہلا تقاضا یہی تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مل جائے جہاں وہ اسلام کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر سکیں، چونکہ دینِ اسلام کے مطابق زندگیاں گزارنے کے لئے افراد کی تعلیم انتہائی لازم ہے اور افراد کی تعلیم کا انحصار نصابِ تعلیم پر ہوتا ہے جو چند علوم پر مشتمل ہوتا ہے جس سے انسان کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں

ابن خلدون فرماتے ہیں:

"والكتابة من بين الصنائع أكثر إفادة لذلك، لأنها تشتمل على العلوم والأنظار بخلاف الصنائع. وبيانه أن في الكتابة انتقالاً من الحروف الخطية إلى الكلمات اللفظية في الخيال، ومن الكلمات اللفظية في الخيال إلى المعاني التي في النفس، فهو ينتقل أبداً من دليل إلى دليل، ما دام ملتبساً بالكتابة وتتعود النفس ذلك دائماً. فيحصل لها ملكة الانتقال من الأدلة إلى المدلولات، وهو معنى النظر العقلي الذي يكتسب به العلوم المجهولة، فتكسب بذلك ملكة من التعقل تكون زيادة عقل. ويحصل به مزيد فطنة وكيس في الأمور، لما تعودوه من ذلك الانتقال"[2]

یعنی تحریری نصاب زیادہ افادیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ یہ چند علوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ تحریر میں حروف سے الفاظ اور الفاظ سے معانی کی طرف، جو نفس میں قائم رہتے ہیں ذہن متوجہ ہوتا ہے اور نفس کے اندر دلائل سے مدلولات کی طرف منتقل ہونے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے جو نامعلوم کو حاصلکرنے میں مدد کرتا ہے اور نامعلوم علوم کو بار بار حاصل کرنے سے عقل و دانش میں اضافہ

---

[1]۔ پاکستان میں تعلیم کے تناظر: ص276

[2]-ابن خلدون، ابوزيد عبدالرحمن بن محمد، مقدمه ابن خلدون، دار الفكر، بيروت الطبعة الثانية، 1408ھ / 1988 م: ص245

ہوتا ہے اور دیگر تمام باتوں کی سمجھ بوجھ اور ہوشیاری میں اضافہ ہوتا ہے۔"

یہ نصابِ تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے انسان وہ علوم حاصل کرتا ہے جن سے وہ پہلے ناواقف ہوتا ہے۔ اس سے اس کی عقل ودانش میں اضافہ ہوتا ہے اور اس میں تمام کاموں اور باتوں کی سمجھ بوجھ، طبعی ہوشیاری اور ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ افراد میں علم وہنر سکھانے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے جس سے معاشرے میں ان کی افادیت بڑھ جاتی ہے اور اسی بنیاد پر افراد میں استدلال کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم افراد میں کسی قسم کی ذہانت، اعلیٰ سوچ، عقل ودانش اور سمجھ بوجھ میں اضافہ نہیں کرتا کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں بلکہ مختلف قسم کے علوم کی پیچیدگیاں انسانی عقل ودانش کو سلب کر لیتی ہیں اور انھیں صحیح اور غلط کی پہچان تک نہیں ہو سکتی۔

قیامِ پاکستان کا دوسرا اہم تقاضا یہ تھا کہ سارے شہریوں میں ایک قوم ہونے کا تصور مستحکم ہوتا اور پوری قوم کو اتحاد واتفاق سے زندگیاں گزارنے کی تربیت نصابِ تعلیم ہی کے ذریعہ دی جاتی ہے جو قوم کو اتحاد کے ساتھ رہنے کی ذہنی تشکیل وتعمیر کرتا ہے اور اسی اتحادِ ملی کے بل بوتے پر ملت وملک کی قیادت ورہنمائی کی صلاحیت عطا کرتا اور ماضی میں اتحادِ ملی پر مبنی قدیم ذخیرۂ علوم وتصنیفات سے مستفید کرتا ہے، بلکہ ملک وملت کی رہنمائی وذہن سازی کی صلاحیت پیدا کرنے میں خاص اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی اتحادِ ملّی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ان میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی سوچ پیدا کرتا ہے،[1] تاکہ حالات کے تقاضوں کی جانچ کرتے ہوئے پوری قوم امتِ واحدہ بن کر زندگی گزار سکے۔

لیکن ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم میں ایسا کوئی مواد موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ امتِ مسلمہ کی تعلیم وتربیت اتحادِ ملّی کے اہم مقصد کو پیشِ نظر کی جاسکے۔

قیامِ پاکستان کا ایک اہم تقاضا یہ بھی تھا کہ مسلمان ہر لحاظ سے ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اور اپنے اسی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک الگ وطن کے متقاضی تھے اور نصابِ تعلیم ایسا ہی ہونا چاہیے جو اس تقاضے کی تکمیل کرتا ہو کیونکہ نصابِ تعلیم ہی ایسا آلہ کار ہے جو انسان کی ضرورتوں کی حفاظت بھی کرتا ہے اور ان سے متعلق

---

[1] -GOP. Minimum Standarads for Quality Education in Pakistan:p6, Published by Ministry of Education,2017,

معلومات کو مقید کرتا ہے تاکہ بلند معیاری زندگی گزارنے کے لیے انسان اپنی زندگی میں کسی بھی وقت اس سے رہنمائی حاصل کرسکے۔ نصابِ تعلیم ہی واحد ذریعہ ہے جس میں انسانی افکار وعلوم کے نتائج کو محفوظ کرکے انھیں دائمی بنادیا جاتا ہے اور یہی نصابِ تعلیم معانی کے وجود کے رتبوں کو بھی بلند کرتا ہے اور پھر نہ صرف سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے بلکہ تعلیمی اداروں سے دور رہنے والے افراد کے لیے بھی یہ کتب رہنمائی کا کام کرتی ہیں،[1] جس سے انسانی عقل و تدبر میں اضافہ ہوتا ہے۔ نصاب انسان میں نئے نئے خیالات پیدا کرتا ہے اور اس کے لیے نئے نئے تجربات کی راہیں کھولتا ہے جس کی بنیاد پر وہ فطرت اور تاریخ کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرتا ہے۔ نصاب ہر مشکل کا حل نکالتا ہے، ہر کمزوری یا کوتاہی کا ازالہ کرتا ہے اور اپنی ضرورت پوری کرنے کی راہیں نکالتا ہے، بھوک، پیاس، قحط، قدرتی آفات، درندوں اور جنگوں جیسے ہر چیلنج کا مقابلہ کرتا ہے بلکہ ایسے حالات میں انسان زیادہ تیزی سے متحرک ہوتا ہے کیونکہ وہ جان چکا ہے کہ اب انسان کے ناخن تدبیر اور سحر تسخیر کی بنا پر ہر مشکل کا حل اس کے پاس ہے اور یہ عقل وشعور انسان کو تعلیم ہی کی بدولت حاصل ہوا ہے۔[2] لیکن ہمارا نصابِ تعلیم ایسا نہیں ہے کہ افراد میں اتنی اعلیٰ قسم کی خوبیاں اور مہارتیں پیدا کرسکے کہ وہ وقت اور حالات کا مقابلہ آسانی سے کرسکے۔

ایک اور اہم تقاضا نظریۂ پاکستان کی حفاظت اور ترویج تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ اب پاکستان کو ایک اسلامی ریاست قرار دے کر اس میں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے اور نظریۂ پاکستان کی ترویج اور حفاظت کے لیے اس کی آنے والی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے اس مقصد کے لیے نصاب تعلیم بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، ایک طرف اس ملک کی مادی و نظریاتی ترقی اور تعمیر کا انحصار اس ملک کے نصابِ تعلیم پر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس ملک و قوم کے نظریات کی اشاعت وترویج نصابِ تعلیم کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین چیزیں ودیعت کی ہیں۔ ایک انسان کا بدن، دوسرے اس کا دل ودماغ اور تیسری وہ چیز وہ ہدایت جو ان سب سے اہم ہے جس کی راہنمائی میں تعلیم وتربیت کے ذریعے انسان کا دل ودماغ صحیح سمت

1- مقدمہ ابن خلدون، 2:241

2- تعلیم کا تہذیبی نظریہ، ص28

میں کام کرتا ہے۔[1]

پاکستان کا نصابِ تعلیم صحیح معنوں میں نظریاتی تعلیم کو اساس فراہم نہیں کر سکا۔اس میں کہیں بھی نظریہ پاکستان کی جھلک دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی کوئی مضمون بچوں میں نظریہ پاکستان سے محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ تعلیمی اداروں سے فارغ نوجوان اسلامی شعائر سے نا آشنا اور اسلامی تہذیب وثقافت اوراسلامی تہذیب وعلوم کی محبت یا دلچسپی سے بے نیاز ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں اتنا شعور ہوتا ہے کہ وہ غیر اسلامی مغربی فلسفہ کے رجحانات ونقصانات کو پہچان سکے،[2] نظریۂ پاکستان سے متعلقہ مضمون کو عام طور پر جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں مضامین ایلیمنٹری نصاب میں تو شامل ہیں لیکن ان کا امتحان پنجاب اگزیمی نیشن کمیشن لیتا ہی نہیں جس کی وجہ سے نہ اساتذہ اس مضمون کو پڑھانے میں دلچسپی لیتے ہیں اور نہ ہی بچے اس مضمون کو پڑھنے کا کوئی شوق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے نئی نسل نظریہ پاکستان سے نا آشنا ہوتی جارہی ہے۔

مسلمانوں کا معاشی تحفظ بھی پاکستان کی نظریاتی اساس کا اہم تقاضا ہے کیونکہ جو قوم اپنا معاشی تحفظ نہیں کر پاتی وہ اپنے عقیدہ وایمان، اخلاق وکردار، فکر وثقافت اور فرد ومعاشرہ کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے اور خاص طور پر اس وقت جب ایک طرف بے حد مالدار افراد ہوں تو دوسری طرف بیچارے غریب اور لاچار افراد جو ایک وقت کی روٹی کے لیے بھی ترستے ہیں،[3] اسی لیے سر سید احمد خان نے اپنے دور میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ اگر مسلمان اپنی پہچان، ساکھ اور مذہب کو بچانا چاہتے ہیں تو انھیں تعلیم ہی کے ذریعہ معاشی طور پر خود کو مستحکم کرنا ہو گا۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو دینی نصابِ تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید نصابِ تعلیم کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ وہ معاشی استحکام حاصل کر کے غیر اسلامی استعماریت کا مقابلہ خود اعتمادی اور حوصلہ مندی سے کر سکیں۔[4]

درج بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ نصابِ تعلیم ایک اہم ذریعہ ہے جو امتِ مسلمہ کی نظریاتی اساس کے

---

[1]۔ایضاً

[2]۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص46

[3]۔یوسف القرضاوی، اسلام اور معاشی تحفظ، مترجم، عبد الحمید صدیقی، بدر پبلی کیشنز، لاہور، 1978ء: ص15، 16

[4]۔ تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ: ص34، 33

تمام تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ مسلمان قوم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتی ہے اور اپنے اسلامی و قومی ورثہ کی بقا کی خاطر اپنی زندگی کا حاصلِ سفر اپنی نئی نسل کو سونپ کر اس دنیا سے رخصت ہوتی ہے لیکن پاکستان میں اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے بارے میں ہماری نظریاتی اور فکری کمزوریوں کی بدولت ملک کی موجودہ صورتحال انتہائی تشویشناک ہو چکی ہے۔ جتنا ہم اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں اتنا ہی نظریاتی اساس سے ہمارا تعلق کمزور ہوتا چلا جارہا ہے اور الیکٹرانک میڈیا نے ہماری نظریاتی اساس کو کمزور کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کے اس دور میں نظریاتی جنگیں میدان سنبھال رہی ہیں اور یہ نظریاتی الجھاؤ صرف ہمارے سیاسی اور ثقافتی حلقوں ہی میں نہیں ہے بلکہ زندگی کا ہر شعبہ نظریاتی الجھاؤ کا شکار ہو چکا ہے۔[1] چونکہ پاکستان بحیثیتِ اسلامی ریاست عالمی مغربی طاقتوں کو ہضم نہیں ہو رہا اسی لیے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نظریاتی جنگ کے میدان میں اُتر آئی ہیں۔ ان کا سب سے اہم وار پاکستان کی نظریاتی اساس کو کمزور کر کے نظریۂ پاکستان کا خاتمہ اور اسے ایک جمہوری ریاست قرار دینا ہے۔ کئی اسلامی ممالک ان غیر اسلامی طاقتوں کے اس وار کی نظر ہو چکے ہیں اور اب وہ پاکستان کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ حقیقت میں یہ جنگ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ہے اور غیر اسلامی ادیان کی اشاعت و تبلیغ کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾[2]

"اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔"

مغربی دنیا نے سیاسی آزادی کے نام پر امتِ مسلمہ کو بیوقوف بنا کر باطل افکار کو بے نقاب کرنے والی رائے دہی کی آزادی، تنقید کی آزادی، تقریر و تحریر کی آزادی اور اجتماع کی آزادی سے محروم کر دیا ہے جبکہ اربابِ اقتدار کو

---

[1] محمود مرزا، مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟، دارالتذکیر، لاہور، طبع اول، 2005ء: ص7

[2] ۔ البقرۃ2:120

چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ اپنے عوام کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں،[1] یہ مغربی استعماریت کا ایک ہتھکنڈا ہے جس کے ذریعہ وہ پاکستان میں بھی اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں اسی لیے تو علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری خطبہ میں انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مغرب استعماریت کو قرار دیا ہے،[2] کیونکہ ان کی ساری کوششیں انسانی ترقی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنی اجارہ داری کے حصول کے لیے ہیں۔

مغربی طاقتیں تو رہی ایک طرف پاکستان کے اندر پاکستان کے بارے میں نظریاتی تصورات وافکار بدلتے دکھائی دے رہے ہیں اور اس میں وہ لوگ ملوث ہیں جن پر بانیانِ پاکستان نے خود گرفت کی تھی،[3] یہ دانشور ایسے ہیں جو دو قومی نظریے کے منکر ہیں اور پاکستان کے نظریاتی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان کو نفرت کی سیاست کا شاخسانہ کہتے ہیں اور کسی صورت یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ پاکستان کسی نظریۂ اسلامی کی بنیاد پر قائم ہوا ہے یا قائداعظمؒ بھی نظریاتی لیڈر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نظریۂ پاکستان اور نظریۂ اسلام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ قائداعظمؒ نے کھلے الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ تصورِ پاکستان اور نظریۂ اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے،[4] یہی لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان کی نظریاتی اساس کو ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوششیں کی ہیں اور ان کا یہی حربہ ہے کہ نظریۂ پاکستان سے محبت اور اس کے تحفظ کے جذبے کو نئی نسل کے دلوں میں اجاگر ہونے سے روکا جائے اس لیے وہ نصابِ تعلیم کو سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

افراد کی تعلیم وتربیت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان اتنا باشعور، قابلِ فہم اور بالغ ہو جائے کہ دورِ جدید کے بدلتے حالات کی بدولت درپیش مسائل کو تحقیق، غور وفکر، مشاہدہ اور قدرت کے مطالعہ سے حل کر سکے[5] لیکن پاکستان کا نصابِ تعلیم ایسا ہے کہ سولہ سالہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی نوجوان اس حالت میں تعلیمی

---

[1] ۔ یوسف القرضاوی، اسلامی نظام۔ ایک فریضہ، ایک ضرورت، مترجم محمد طفیل انصاری، البدر پبلیکیشنز لاہور، طبع اول، نومبر 1993ء: ص28

[2] ۔ خورشید احمد، اسلامی تحریک۔ درپیش چیلنج، انسٹی ٹیوٹ پالیسی اسٹڈی اسلام آباد، طبع دوم، 1995ء: ص63

[3] ۔ اسلامی تحریک۔ درپیش چیلنج: ص64

[4] ۔ ایضاً: ص64

[5] ۔ مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟: ص9

اداروں سے فارغ ہوتے ہیں کہ نہ تو ان میں کوئی اسلامی شعائر کا رنگ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی ان میں اسلامی تہذیب وثقافت کی محبت یا دلچسپی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ مغربی فلسفہ پر تنقید کر سکیں اور فکر و تحقیق کے ذریعہ اسلامی تہذیب وعلوم کے سرمایہ کا سراغ لگا سکیں یہی چیز مسلم معاشروں کی ہر سو تنزلی کا باعث بنی۔[1] ایسے ذہنوں والے نوجوانوں پر کوئی بھی پارٹی حکومت کرے، کسی کی بھی وزارتِ عظمیٰ قائم ہو، اور کیسے ہی عظیم منشور اور دستاویز ملکی فضاؤں میں لہرائے جائیں انھیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تو ایسے حالات میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی، نہ مادی اور نہ نظریاتی[2] اور عالمی طاقتیں یہی تو چاہتی ہیں اور ہر ملک پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا ان کا شیوہ ہے تاکہ تمام ملکوں کو کنٹرول کر کے خود عالمگیر حکمران بن کر پوری دنیا پر حکمرانی کر سکیں اور اپنی من مانی کر سکیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴾[3]

"اور جب تم ان (کے تناسب اعضا) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر کو توجہ سے سنتے ہو (مگر فہم وادراک سے خالی) گویا لکڑیاں ہیں جو دیواروں سے لگائی گئی ہیں، (بزدل ایسے کہ) ہر زور کی آواز کو سمجھیں (کہ) ان پر بلا آئی، یہ (تمہارے) دشمن ہیں ان سے بے خوف نہ رہنا۔ خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔"

دنیا کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام دشمن عناصر اسلام سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں اور اسی لیے دینِ اسلام اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے ہیں اور سب سے پہلے مسلمان قوم کے نظامِ تعلیم

---

[1] ۔ ایضاً

[2] ۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص46

[3] ۔ المنافقون 4:63

میں پڑھائے جانے والے نصابِ تعلیم ہی کو بدلنے اور اسے اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق تشکیل دینے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔[1]

اسی لیے مغرب کا سب سے پہلا حملہ پاکستان کے نصابِ تعلیم پر ہوتا ہے تاکہ پاکستان کے مسلمانوں کے اندر ایک طرف نظریاتی جاہت کو ختم کرتے ہوئے اسلامی نظریۂ حیات کو ختم کر دیا جائے تو دوسری طرف صنعتی وپیداواری صلاحیت و ٹیکنیکل مہارت سے محروم کرتے ہوئے انھیں معاشی طور پر بد حال کر دیا جائے تاکہ اس معاشی بدحالی سے تنگ آکر اپنے نظریات پر سمجھوتہ کرتے ہوئے وہ مغربی ترقی یافتہ ممالک سے امداد طلب کریں جس کے بدلے وہ اپنی شرائط لاگو کریں اور پورے یورپ اور یورپی تہذیب وثقافت اور اس کے قائدانہ کردار اور سبھی کا خاتمہ کرنے والی پورے عالمِ اسلامی کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار نہ ہونے دیا جائے۔

ہر پاکستانی کو دینِ اسلام کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا پورا حق ہے۔[2] اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر آج تک جتنی بھی تعلیمی پالیسیاں، منصوبہ جات اور کمیشن بنے، کانفرنسز منعقد ہوئیں یا دستاویز بنے سب میں تعلیم کا ایک اہم مقصد پاکستان کا اسلامی کردار قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس مقصد کے حصول کے لیے افراد کی سیرت وکردار کی تعمیر وتشکیل ایک انتہائی لازمی امر ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ سکولوں میں نظریاتی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے[3] اس کے علاوہ جو نظریاتی اسلامی بنیادیں پاکستان کی تخلیق کا باعث بنیں انہیں مختلف سطحوں پر نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جائے،[4] تاکہ یہ انقلاب تعلیم کے ذریعہ لایا جائے لیکن بدقسمتی سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح نصابِ تعلیم میں بھی اس انقلابی عمل کا آغاز نہ ہو سکا جو ہمیں پاکستان کی غایتِ وجود کی راہ پر گامزن کر سکتا اور نہ ہی ہمارے طرزِ عمل میں ایسی تخلیقی روح کارفرما ہوئی جو پاکستانیوں کو ایمانی وتہذیبی شعور کی روشنی میں زندگی کی نئی راہیں نکالنے کے لیے متحرک کر سکے،[5] اور اس

1۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص33

2۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا دستور: آرٹیکل 20(الف)

3۔ پاکستان میں تعلیم کے تناظر: ص42، 43

4۔ شاہد، ایس ایم، سیکنڈری تعلیم، مجید بک ڈپو، لاہور، طبع اول، 2011ء: ص292

5۔ تعلیم کا تہذیبی نظریہ: ص32

کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے لیکن حکومتِ پاکستان اس معاملے میں سنجیدگی سے عمل کرتی دکھائی نہیں دیتی۔

جدید دور میں طاقتور قوموں کی توجہ روائتی جنگوں سے ہٹ کر نظریاتی جنگوں کی جانب مبذول ہو چکی ہے۔ نظریاتی جنگ میں میدان مارنا زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے جس میں فوجوں، جنگی میزائل، توپوں اور مورچہ بندی کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ جان چکے ہیں کہ عسکری طاقت کا استعمال مسلمانوں کے اندر اشتعال انگیزی اور سرکشی کو مزید بھڑکا دیتا ہے اس لیے انھوں نے نظریاتی فریب کا سہارا لیا ہے،[1] جس میں چند مخصوص حکمتِ عملیوں کو اپنا کر مستقل مزاجی کے ساتھ نظریاتی جنگوں میں فتح حاصل کی جاسکتی ہے اس کا بہترین حربہ نصابِ تعلیم کو بنایا جاتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ نصابِ تعلیم ہی وہ واحد راستہ ہے جو پاکستان کے مسلمانوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کرتا ہے، انہیں ایک نظریاتی اساس پر مستحکم کرتا ہے۔ اور اس کی خاطر قربانیاں دینے کے لیے ان میں جوش وجذبہ پیدا کرتا ہے۔ اہلِ مغرب نے نصابِ تعلیم میں من مانی تبدیلیوں کو اپنا ہتھکنڈا بنا لیا ہے جو پاکستانیوں کو فکری و نظریاتی پریشانی کا شکار کر رہا ہے اور انھیں شخصی آزادی کے نام پر ان کی نظریاتی اساس سے دور کرنے کی سوچ وفکر پیدا کرتا ہے اور یہ سلسلہ قیامِ پاکستان سے ہی چلا آرہا ہے۔ ہر دور میں ہر نئی حکومت نے کوئی نہ کوئی پالیسی، منصوبہ جات، کمیشن یا کمیٹیاں بنائیں اور اپنے کام کو پہلے سے زیادہ کامیاب بنانے کے لیے بڑی بڑی سفارشات پیش کیں، ان کے عملی نفاذ کے لیے بڑی بڑی منصوبہ بندی کی لیکن پھر بھی ناکام ہوگئی اور یہ سلسلہ قیامِ پاکستان سے آج تک جاری ہے اور نظامِ تعلیم بہتری کے بجائے ابتری کی جانب بڑھ رہا ہے۔

تجاویز وسفارشات

- ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کرنے کے لیے جو بھی نصابِ تعلیم اپنائیں اس میں اپنے نظریات وعقائد اور افکار کو اپنے تہذیبی شعور کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کی وراثت کو پانے کے لیے مضبوط ہاتھ سامنے آئیں جو اپنے اندر اس نظریۂ حیات کی تکمیل کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں اور آنے والے وقتوں میں دینِ اسلام

---

[1] اسلامی نظام۔ ایک فریضہ، ایک ضرورت: ص24

کے بہترین تحفظ کی خاطر درپیش ہر طرح کے چیلنجز کا جواب بھرپور طریقہ سے جواب دے سکیں۔

- نظریۂ پاکستان کی ترویج اور آئین کی بالادستی حکومتِ پاکستان کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے اسے نہایت اہم اور ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نظام حکومت منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے اور جہاں تک اس کی بنیاد کا تعلق ہے تو وہ قرآن وسنہ کے اصول ہیں۔
- نظریۂ پاکستان کے شعور کو زندہ رکھنے اور لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے میڈیا کا بھرپور مثبت استعمال کیا جائے جس پر غیر ملکی نظریات کی تشہیر پر پابندی لگائی جائے اور اپنی اسلامی تہذیب وثقافت کی تشہیر کے لیے شعبہ اطلاعات ونشریات سے کام لے کر لوگوں کے دلوں سے نظریۂ پاکستان سے متعلق شکوک وشبہات کو دور کیا جائے اور حکومت پر یقین واعتماد پیدا کیا جائے۔
- افراد کی تعلیم وتربیت اور یاد دہانی کے لیے نظریۂ پاکستان اور آئینی اصلاحات کو بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے منتخب شدہ نصابِ تعلیم کا لازمی حصہ بنادیا جائے۔
- اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور سے آج تک مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں نصابِ تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں خاص طور پر ان مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی جو انسان کو انسان بنانے میں روحانی اور اخلاقی قدروں کا مرکزی درجہ رکھتے تھے اس لیے بحیثیتِ مسلمان قوم ہمیں بھی اپنے نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے جو بچوں کی اخلاقی تربیت بہتر انداز سے کر سکیں۔
- جہاں تک نصابِ سازی کا تعلق ہے تو نصاب سازی اس انداز سے نہیں کرنی چاہیے کہ کسی کو ڈاکٹر بنادیا جائے کسی کو سائنسدان، کسی کو انجنیئر یا کسی کو مذہبی سکالر بلکہ اس تصور کے ساتھ نصابِ تعلیم مرتب کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں عبد بنا کر بھیجا ہے اور اس حیثیت سے ہمیں کچھ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جنہیں احسن طریقہ سے نبھانا ہم سب کا فرض ہے تو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس طرح نصاب سازی کرنی چاہیے کہ ہر مضمون میں ایسی روح پیدا ہو جائے کہ اس سے تعلیم یافتہ ایک رکشہ چلانے والا، ایک ڈاکٹر، ایک استاد، ایک سائنسدان یا ایک فوجی اس جذبہ اور مقصد کے تحت کام کرے کہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا عبد ہے اور اللہ کی رضا اور اتباع رسول ﷺ کے حصول کے لیے کام کر رہا

ہے۔

- تیز رفتار سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں عالمی اور قومی تقاضے تیزی سے بدل رہے ہیں اور علوم میں سب سے زیادہ اہمیت سائنسی علوم کو دی جارہی ہے کیونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں سائنس داخل ہوچکی ہے۔ دفاع کا میدان ہو یا معیشت کی دوڑ، سیاست کی جنگ ہو یا سیاحت کی تشہیر، تعلیم وتربیت کی بات ہو یا تجربات کا انتخاب؛ ہر میدان میں سائنس نے گھر کرلیا ہے لیکن اس کے لیے پوری قوم کو سائنسدان بنانے کی مہم غیر فطری ہے۔ پاکستان بھلے ہی ایک پسماندہ ملک ہے اور اسکے مالی وسائل محدود ہیں لیکن اس میں بھی اس جدیدیت اور ترقی کا عمل تیز کرنے اور عوام میں تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے نئے معاشرتی رویوں اور سائنسی سوچ وفکر کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم کے ہر فرد کو بہترین تعلیم وتربیت کے ذریعہ ہر محاذ کے لیے تیار کرکے اپنے ملّی و قومی تشخص کا تحفظ اور دفاع ہر صورت ممکن بنایا جائے۔

حاصلِ بحث

درج بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصابِ تعلیم ایسا ذریعہ ہے جو امتِ مسلمہ کی نظریاتی اساس کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمان قوم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتی ہے اور اپنے اسلامی و قومی ورثہ کی بقا کی خاطر اپنی زندگی کا حاصلِ سفر اپنی نئی نسل کو سونپ کر اس دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی وراثت میں بہترین اضافہ کرکے اگلی نسلوں کو منتقل کریں جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کرنے کے لیے جو بھی نصابِ تعلیم اپنائیں اس میں اسلامی نظریات وعقائد وافکار کو اپنے تہذیبی شعور کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کی وراثت کو پانے کے لیے مضبوط ہاتھ سامنے آئیں جو اپنے اندر اس نظریۂ حیات کی تکمیل کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں اور آنے والے وقتوں میں دینِ اسلام کے بہترین تحفظ کی خاطر درپیش ہر طرح کے چیلنجز کا جواب بھرپور طریقہ سے دے سکیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں اس نظریۂ حیات کی دعوت و تبلیغ کی صلاحیت بھی موجود ہو تاکہ انسانیت کو دنیا اور آخرت کے خسارے سے بچایا جاسکے۔

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبَین میں اسبابِ اختلاف

فرخ سوار خوشحالی*

ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری**

ABSTRACT

Imam Abu Hanifa was a great jurist. He not only vested his talent, time and energy for the development of Fiqh but he headed a team of scholars for compilation of Fiqh and trained his disciplines for the job. Among his renowned pupils are Imam Abu Yousaf and Imam Muhammad. One of his qualities as a teacher and mentor is that he encouraged dialogue, inter-action and difference of opinions. As a result we see that Imam Abu Yousaf and Imam Muhammad differ from his juristic opinions on many occasions. In this article we would try to analyze the reasons of difference between Imam Abu Hanifa and his disciples Imam Abu Yousaf and Imam Muhammad.

Keywords: اسباب، امام ابو حنیفہ، صاحبین، فقہ، اختلاف، تلامذہ، دلائل، احادیث

ائمہ فقہ کا امت محمدیہ پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت سے عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص کی بنا پر احکام و مسائل کا استنباط کیا اور پھر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں غور و فکر کے بعد پیش کیا۔ اگر وہ یہ علمی مشقت نہ کرتے تو ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قرآن و سنت سے احکام کا علم حاصل کرتا۔

ان فقہاء کی فہرست میں امام ابو حنیفہؒ کی ذات نمایاں ہے جنہوں نے فقہ کے میدان میں نہ صرف خود گراں قدر خدمات سر انجام دیں بلکہ اس فن کے ماہرین بھی اس امت کو دیے جن میں نمایاں نام امام ابو یوسف اور امام

* پی ایچ ڈی سکالر، منہاج یونیورسٹی، لاہور

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور

محمد کا ہے۔ انہوں نے اس فن کو کتابی لباس پہنا کر امت کیلئے تحفۂ جاوداں بنا دیا۔ پھر ان فقہائے کرام میں آراء میں مختلف مسائل میں اختلاف بھی ہوا جس نے امت مسلمہ کے لیے مزید آسانیوں کو جنم دیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن العلماء ورثة الأنبياء." [1]

"بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔"

اس حدیث کی رو سے علمائے کرام زمین میں انبیاء علیہم السلام کے نائب اور وارث ہیں۔ اگر ہم تاریخ اسلامی کا جائزہ لیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دعوت و تبلیغ دین کا جو فریضہ انبیاء کرام علیہم السلام سر انجام دیتے رہے ہیں امت محمدیہ کے علماء نے بھی حسبِ مقدور اس فریضے کو انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ہم تک دین اسلام اپنی اصل حالت میں پہنچا ہے۔ علماء اور فقہاء کے باہمی اختلافات کسی حسد یا تعصب کی وجہ سے نہیں تھے کیونکہ تمام فقہاء کرام شریعت اسلامیہ کا اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو ہی قرار دیتے ہیں اور اگر کسی مسئلہ میں قرآن وس سنت سے دلیل نہ ملے تو پھر قیاس اور اجتہاد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور کسی مسئلہ میں اگر ان کی رائے کتاب وسنت سے متعارض ہو جائے تو علم ہونے پر وہ اس رائے سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد گرامی ہے:

"إذا قلت قولاً يخالف كتاب االله تعالىٰ وخبر الرسول ﷺ فاتركوا قولي." [2]

" اگر میں کوئی ایسی بات کروں جو کتاب وسنت کے مخالف ہو تو میرے قول کو ترک کر دو۔"

امام ابو حنیفہ کے بارے میں بعض متاخرین کی رائے یہ بھی ہے کہ وہ حدیث کے مقابلے میں اجتہاد اور قیاس کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی امام صاحب کے بارے میں یہ رائے کس حد تک درست ہے اس حوالے سے امام صاحب کا اپنا قول ہے:

"إذا صح الحديث فهو مذهبي." [3]

---

[1] - ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، بیروت، دارالفکر 3: 3317

[2] - کاسانی، علاؤالدین ابوبکر، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت دارلکتب العربی، 1982ء، 64:1

[3] - ایضاً، 82:1

"حدیث صحیح ہی میرا مذہب ہے۔"

اس بیان سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے باہمی اختلافات کا منشاء حسد، تعصب یا عناد نہیں ہے اور نہ ہی یہ اختلافِ حق و باطل ہے بلکہ مختلف فیہ مسائل کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن میں افضل و غیر افضل، راجح و غیر راجح کا اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کا ثمرہ یہ ہے کہ جب حضرات ائمہ میں سے کسی کا قول صحیح حدیث کے خلاف ہو تو اس کا کوئی سبب یا عذر ہوتا ہے جیسے:

1. اس امام کے علم میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ حدیث حضور نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے۔
2. یا وہ نہیں سمجھتا کہ یہ حدیث اس مسئلے سے متعلق ہے۔
3. یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ حدیث میں بیان کردہ حکم منسوخ ہے۔
4. یا وہ اس حدیث کو ضعیف سمجھتے ہوئے قابل حجت نہیں سمجھتا۔

ان چاروں اعذار کے متفرق اسباب ہوسکتے ہیں مثلاً حدیث کا امام کے علم میں نہ ہونا۔ اگر کسی امام تک کوئی حدیث نہ پہنچی ہو تو ظاہر ہے اس نے اس مسئلے میں ظاہر آیت کے مطابق فیصلہ کیا ہوگا۔ یا اس نے کسی دوسری حدیث کی روشنی میں فیصلہ کیا ہوگا یا قیاس یا استصحاب حال کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا ہوگا۔ چنانچہ اس کا فیصلہ کبھی تو اس حدیث کے موافق ہوگا اور کبھی مخالف ہوگا۔ اسی طرح بعض اوقات کسی حدیث کے دو طرق ہوتے ہیں جن میں سے ایک صحیح اور دوسرا ضعیف ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ حدیث کسی امام کو ضعیف سند سے پہنچتی ہے تو اس کے لیے اس پر عمل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ جب کہ یہی حدیث دوسرے امام تک صحیح سند کے ساتھ پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ اس طرح ائمہ کے درمیان اختلاف کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

حقیقتِ اختلاف

بعض مسائل کے متعلق امام ابو حنیفہؒ سے ایک سے زائد اقوال یا روایات مروی ہیں۔ کتب فقہ میں ایسے مسائل کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہم بطور امثلہ پہلے ان میں سے چند ایک مسائل ذکر کریں گے، اس کے بعد ان مختلف اقوال و روایات کی وجوہات بیان کریں گے:

1. گھوڑے کے جھوٹے پانی کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کی دو روایات ہیں: حسن بن زیاد کی روایت یہ ہے کہ اس کا

جھوٹا پانی ناپاک ہے جبکہ ظاہر روایت کے مطابق پاک ہے۔[1]

2. سجدے کی جگہ پر نجاست ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایات ہیں۔ امام محمدؒ ان سے نقل کرتے ہیں کہ اس صورت میں نماز جائز نہ ہو گی جب کہ امام ابو یوسفؒ کی روایت ہے کہ نماز جائز ہو گی۔[2]

3. نماز وتر کے وجوب اور عدم وجوب کے حوالے سے امام ابو حنیفہؒ سے تین روایات مروی ہیں۔ حماد بن زیدؒ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ وتر فرض ہیں، یوسف بن خالدؒ السمتی نقل کرتے ہیں کہ وتر واجب ہیں جبکہ نوح بن ابی مریم المروزی کی الجامع میں امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ وتر سنت ہیں۔[3]

مذکورہ بالا تینوں مسائل میں امام ابو حنیفہؒ سے ایک سے زائد روایات مروی ہیں: روایات کے اس اختلاف کی متعدد وجوہ اور اسباب ہو سکتے ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

1. بات سننے میں غلطی ہونا۔ مثلاً جب امام صاحب سے کسی معاملہ میں پوچھا گیا تو آپ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ 'جائز نہیں' مگر راوی پر بات مشتبہ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے جیسا سنا ویسا نقل کر دیا۔ اور دوسرے راوی نے صحیح بات سنی اور وہی نقل کی تو مسئلہ میں دو روایتیں ہو گئیں۔

2. امام صاحب کی ایک رائے تھی جس سے بعد میں آپ نے رجوع کر لیا اور جو راوی امام صاحب کے پاس آتا جاتا تھا اس کے علم میں وہ رجوع آیا اور اس نے آخری رائے نقل کی اور دوسرا راوی جس کا آنا جانا کم تھا امام صاحب کی آخری رائے اس کے علم میں نہ آ سکی تو اس نے وہی پہلی رائے نقل کی جس کی وجہ سے مسئلہ میں دو روایتیں پیدا ہو گئیں۔

3. امام صاحبؒ نے ایک بات قیاس کی رو سے فرمائی اور دوسری استحسان کی رو سے۔ ایک راوی نے پہلی بات سنی اور اس کو روایت کیا اور دوسرے نے دوسری بات سنی اور اس کو روایت کیا جس کی وجہ سے مختلف اقوال پیدا ہو گئے۔

4. کسی مسئلہ میں امام صاحب نے دو آراء بیان فرمائیں: ایک قضاء (فتویٰ) کی جہت سے اور دوسری احتیاط

---

[1] ۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، 6270:1

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ شامی، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقی، شرح عقود رسم المفتی، ص:15

(تقوی) کی جہت سے اور ہر راوی اسی طرح حکم نقل کرتا ہے جس طرح اس نے سنا ہے۔ پس اقوال میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

علامہ شامیؒ اس کے بعد اختلافِ روایات کے مزید دو اسباب ذکر کرتے ہیں:

5. کسی حکم میں مجتہد کا متردد ہونا بایں وجہ کہ اس کے نزدیک دلائل میں تعارض ہے اور کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں ہے۔

6. ایک ہی دلیل کے مدلول و مفہوم میں مجتہد کی رائے کا مختلف ہونا کیوں کہ دلیل کبھی دو یا دو سے بھی زیادہ وجوہ کا احتمال رکھتی ہے۔ اس لیے مجتہد ہر احتمال پر ایک جواب کی بنیاد رکھتا ہے۔[2]

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین اختلاف کی وجوہات

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں اور حنفی المذہب ہیں۔ اس کے باوجود کتب فقہ میں ایسے مسائل کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جن میں امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں صاحبان امام ابو حنیفہ کے شاگرد اور مقلد ہیں، تو پھر بعض مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیوں کرتے ہیں؟

اس باب میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ائمہ کے درمیان یہ اختلافات محض علمی تحقیق اور اخلاص پر مبنی ہیں۔ اس کا سبب باہمی حسد و بغض، تعصب و عناد، علمی برتری یا خواہش نفس کی پیروی نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے پیش نظر للّٰہیت کے ساتھ حق کی اتباع کرنا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی درست تعبیر اور ان کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ تاہم اس فقہی اور فروعی اختلاف کے چند اسباب درج ذیل ہیں:

---

[1] ۔ ایضاً

[2] ۔ الشيباني، محمد بن الحسن، الجامع الصغير وشرحه النافع الكبير، بيروت دار النشر، عالم الكتب 1406، 254:1

1۔ عصری اور زمانی اختلاف

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین مختلف مسائل میں پائے جانے والے اختلاف کا ایک سبب زمانے کا مختلف ہونا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا زمانہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے زیادہ قریب تھا۔ یہ تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے خیر القرون کا نام دیا ہے۔ جب کہ صاحبین کے زمانے میں حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں فتنوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ الغرض حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے تھے۔ چنانچہ صاحبین نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر بہت سے مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے اقوال کے خلاف فتوی دیا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر امام ابو حنیفہؒ اس دور میں ہوتے تو وہ بھی یہی فتوی دیتے۔ اسی لیے اکثر فقہاء کرام نے اپنی کتب میں لکھا ہے:

"هذا اختلاف عصر وزمان لا حجة وبرهان." [1]

"یہ عصری وزمانی اختلاف ہے نہ کہ کسی دلیل اور حجت کی بنا پر۔"

مثلاً اگر عید کی نماز میں امام یا مقتدی کو حدث لاحق ہو جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے یہاں اس شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ جا کر تیمم کرے اور اپنی نماز جاری رکھے، خواہ اس نے وضو سے نماز شروع کی تھی یا تیمم سے۔ صاحبینؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے وضو کے ساتھ نماز شروع کی تھی تو اب اس کے لیے تیمم کی اجازت نہیں ہو گی۔ بلکہ یہ شخص جا کر وضو کرے اور پھر آ کر اپنی نماز جاری رکھے۔ یہ اختلاف زمانے کے اعتبار سے ہے۔ علامہ جلال الدین خوارزمیؒ کہتے ہیں:

"فمن مشائخنا من قال : هذا اختلاف عصر و زمان فكان في زمن أبي حنيفة يصلى صلاة العيد في جبانة بعيدة من الكوفة." [2]

"ہمارے مشائخ میں سے کچھ نے فرمایا: یہ اختلاف عصری اور زمانی ہے۔ وہ اس طرح کہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں نماز عید کوفہ سے دور کھلے میدان میں پڑھی جاتی تھی۔"

---

[1] - مرغینانی، علی بن ابی بکر، الهدایه شرح البداية، لاہور، مکتبه اسلامیه، 3: 275

[2] - شیخ زاده، عبد الرحمن بن محمد، مجمع الأنهر فی شرح ملتقى الأبحر، بیروت، دار الكتب العلمية 1976ء، 3: 345

امام ابو حنیفہؒ نے کسی مسئلہ کے متعلق اپنے زمانہ کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے حکم لگایا اور صاحبینؒ کے دور میں حالات تبدیل ہو گئے لہٰذا انہوں پھر اس کے مطابق حکم لگایا چنانچہ اس طرح اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔

2۔ مکمل فکری آزادی

امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ کے ہاں اپنے اساتذہ کے ساتھ عقیدت و احترام کے باوجود مکمل فکری آزادی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے اساتذہ سے متعدد مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے بھی اپنے تلامذہ پر یہ پابندی عائد نہیں کی تھی کہ میں جو فیصلہ کروں اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرو بلکہ ان کو علمی اختلاف کا مکمل اختیار تھا اور ہر مسئلہ کو باہمی مشورے سے حل کیا جاتا تھا۔ علامہ شامیؒ رسم المفتی میں علامہ حصکفیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:[1]

> "امام ابو حنیفہؒ نے غایت احتیاط اور کمال تقوی کی وجہ سے اور یہ بات جاننے کی وجہ سے کہ اختلاف آثار رحمت ہے، اپنے اصحاب کو یہ حکم دیا تھا کہ 'اگر تمھیں کوئی دلیل مل جائے تو تم اس کے مطابق رائے قائم کر سکتے ہو، چنانچہ آپ کا ہر شاگرد آپ سے مروی کسی روایت کو لے لیتا اور اسے دلیل سے ترجیح دیتا تھا۔"[2]

3۔ مجتہد مطلق کی صلاحیت

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صاحبین کی صلاحیتیں مجتہد مطلق کے درجہ کی مانی گئی ہیں یعنی انہوں نے اصول و فروع میں کسی کی تقلید کے بغیر ادلہ اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس) سے فروعی مسائل و احکام مستنبط کیے ہیں۔ لہٰذا اتنی عظیم اجتہادی بصیرت والے اصحاب کسی مسئلہ پر غور و خوض نہ کریں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ صاحبینؒ کی صلاحیت کے متعلق فرماتے ہیں:

> "یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے ان کے اختلاف کی فہرست کافی طویل ہے۔"[3]

---

[1] ۔ شامی، شرح عقود رسم المفتی، ص:16

[2] ۔ خوارزمی، محمد جلال الدین، الکفایہ علی فتح القدیر، کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، 123:1

[3] ۔ شاہ ولی اللہ، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، مترجم: مولانا صدر الدین اصلاحی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، 44:1

4۔ اصول میں اختلاف

اصولِ فقہ کے بعض بنیادی اصول وضوابط میں صاحبینؒ کا امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ اختلاف ہے لہٰذا اصول میں اختلاف کے ساتھ اقوال کیسے متحد رہ سکتے ہیں؟ اس کی چند ایک امثلہ درج ذیل ہیں:

I. امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصل یہ ہے کہ جو چیز ابتداء میں فرض کو متغیر کر دے وہ آخر میں بھی اس کو متغیر کر دے گی جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ مثلاً تیمم کنندہ اپنی نماز کے آخر میں بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد سلام سے پہلے پانی دیکھ لے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصل مذکور کے پیش نظر اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور صاحبینؒ کے نزدیک فاسد نہیں ہو گی۔[1]

II. امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصل یہ ہے کہ محرم کا مناسکِ حج کو ان کے اوقات سے مقدم یا موٴخر کرنا موجبِ دم ہے، صاحبینؒ کے نزدیک موجبِ دم نہیں ہے۔ سو اگر محرم نے طوافِ زیارت کو موٴخر کر دیا یہاں تک کہ ایام نحر گزر گئے تو امام صاحبؒ کے نزدیک دم واجب ہو گا، صاحبینؒ کے نزدیک دم واجب نہیں۔[2]

III. امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان نجاست غلیظہ اور خفیفہ کے ثبوت کے لیے اصول میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نجاست غلیظہ ایسی نص سے ثابت ہوتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی نص، طہارت کو ثابت کرنے والی نہ ہو اور نجاست خفیفہ دو باہم متعارض نصوص سے ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ صاحبین ایسی نجاست کو نجاست غلیظہ کہتے ہیں جس کے نجس ہونے پر اجماع واقع ہو۔ اور جس کے نجس ہونے میں اختلاف ہو اسے نجاست خفیفہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اس اصولی اختلاف کی بنیاد پر بہت سے مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔[3]

---

[1] ۔ المرغینانی، شرح البدایة، 60:1

[2] ۔ الکاسانی، بدائع الصنائع، 2: 132

[3] ۔ ایضاً، 80:1

5۔ امام ابو حنیفہؒ کا اپنے سابقہ قول سے رجوع کرنا

بعض مسائل ایسے ہیں جن میں امام ابو حنیفہؒ سے پہلے ایک قول منسوب کیا گیا لیکن بعد میں انہوں نے اس سے رجوع کر لیا یا اس کے علاوہ کسی دوسرے قول کو ترجیح دی اور صاحبینؒ نے آپ کے دوسرے قول کو دلیل کی بنیاد پر ترجیح دی۔ چنانچہ اس طرح صورتِ اختلاف پیدا ہو گئی۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: فتاوی ولوالجیہ کی کتاب الجنایات میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:

"ما قلت قولاً خالفت فيه أبا حنيفة إلا قولا قد كان قاله." [1]

"میں نے امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے خلاف جو بھی قول کیا ہے وہ خود ان کا سابقہ قول ہے۔"

اور امام زفرؒ سے مروی ہے:

"میں نے جس مسئلہ میں بھی امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا اور علیحدہ رائے قائم کی ہے وہ خود ان کا قول ہے جس سے انہوں نے رجوع کر لیا۔"[2]

6۔ صاحبین کا امام ابو حنیفہؒ کے اقوال کو قرآن و سنت پر پیش کرنا

اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ صاحبینؒ امام ابو حنیفہؒ کے اقوال کو قرآن و سنت اور اقوالِ صحابہ پر پیش کرتے اگر انہیں قرآن و سنت یا اقوالِ صحابہ سے اپنے مذہب کی تائید حاصل ہو جاتی تو وہ مذہب حنفی پر برقرار رہتے اور اگر انہیں اپنے مذہب کے موافق کوئی دلیل نہ ملتی تو ایسی صورت میں وہ اپنی رائے بدل لیتے، چنانچہ اس طرح اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

"امام محمدؒ نے پہلے امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالکؒ سے مؤطا پڑھی۔ اس کے بعد غور و فکر شروع کیا اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلے کو مؤطا سے مقابلہ کر کے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو درست، ورنہ صحابہ اور تابعین کے مختلف اقوال و مذاہب کی تحقیق کی۔ اگر کسی کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس

---

[1] ۔ شامی، شرح عقود رسم المفتی، ص:16

[2] ۔ایضاً

صورت میں وہ مذہب حنفی پر قائم رہے لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان دلیل پر تھی اور اکثر علماء کے عمل سے یا حدیث صحیح سے مخالفت ہو رہی تھی جس پر فقہاء نے عمل کیا ہو، تو ایسی صورت میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔"[1]

7۔ صاحبین کا ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج تسلیم نہ کرنا

بعض مسائل میں امام ابو حنیفہؒ نے ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا تو اس طرح صورت اختلاف پیدا ہو گئی۔[2]

8۔ اختلاف بوجہ استحسان و قیاس

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین بعض مسائل میں استحسان اور قیاس کی بنیاد پر اختلاف پایا جاتا ہے یعنی امام ابو حنیفہؒ کا قول مبنی بر استحسان ہے اور صاحبینؒ کا قول مبنی بر قیاس، تو اس طرح دو مختلف اقوال ہونے کی وجہ سے اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔ مثلاً امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کھڑے ہو کر نوافل شروع کرنے کے بعد بلا عذر بیٹھ جانا جائز ہے، صاحبین کے نزدیک جائز نہیں۔ امام ابو الحسن المرغینانی لکھتے ہیں:

"وإن افتتحها قائماً ثم قعد من غير عذر جاز عند أبي حنيفةؒ وهذا استحسان وعندهما لايجزيه وهو القياس." [3]

"اگر کسی نے کھڑے ہو کر نفلی نماز شروع کی پھر وہ بغیر کسی عذر کے بیٹھ گیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک استحسان کی رو سے جائز ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں اور قیاس کا بھی یہی تقاضا ہے۔"

9۔ اختلاف بوجہ تخفیف و عمومِ بلویٰ

بعض مسائل میں صاحبینؒ نے آسانی اور عموم بلویٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی قول اختیار کیا ہے مثلاً ایسا لباس جس پر گوبر لگا ہو اس میں نماز پڑھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر گوبر کی مقدار ایک

---

[1] ۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، ص:43

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ الھدایہ شرح البدایۃ، 29:2

درہم ہو تو اس لباس میں نماز جائز نہیں، صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک گوبر نجاست خفیفہ ہے اور دوسرے صاحبینؒ نے عمومِ بلوی کو مد نظر رکھا ہے کیونکہ بھیڑ بکریاں اور دیگر مویشی پالنے والے لوگوں کا اس سے بچنا مشکل ہے۔ اس طرح صورت اختلاف پیدا ہو گئی۔

10۔ صحتِ حدیث کا معیار مختلف ہونا

اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک حدیث جس سے امام ابو حنیفہؒ نے کسی مسئلہ کا استنباط کیا ہے، ان کے نزدیک صحیح ہے لیکن صاحبین اس کو صحیح نہیں مانتے بلکہ ان کے نزدیک وہ صحیح سے کم درجے کی ہے۔ چنانچہ صحت حدیث کے اختلاف کی وجہ سے مسائل میں بھی اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔

مثلاً امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مسح علی الجوربین مستحب ہے واجب نہیں ہے جب کہ صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبینؒ نے جس حدیث مبارک سے استدلال کیا ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے واجب ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دلیل قطعی کا ہونا ضروری ہے۔

نتائج بحث

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ:

- امام ابو حنیفہؒ فقہ کے بہت بڑے امام تھے جنہوں نے نہ صرف فقہی اصول وضع کیے بلکہ انہوں نے ایسے تلامذہ بھی تیار کیے جنہوں نے فقہ کو احسن انداز میں مرتب کیا۔
- امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ ان سے مختلف فقہی مسائل میں مختلف اسباب کی بنا پر اختلاف کرتے تھے جس سے فقہ حنفی میں توسع پیدا ہوا اور بعد میں آنے والوں کے لیے سہولت پیدا ہوئی۔
- امام صاحب سے ان کے تلامذہ کے اختلاف سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تقلید محض نہیں تھی بلکہ سوچ اور فکر کی آزادی تھی جس کی وجہ سے تلامذہ اپنے استاد سے اختلاف کرتے تھے۔
- فقہی مسائل میں اختلاف کے متعدد اسباب ہوتے ہیں جن میں زمانے کا مختلف ہونا، احادیث پر حکم لگانے میں اختلاف ہونا یا احادیث کا نہ پہنچنا وغیرہ شامل ہیں۔
- جس طرح امام صاحب کے تلامذہ نے اپنے استاد کی آراء سے مختلف اسباب کی بنا پر اختلاف کیا، آج بھی فقہاء اور مجتہدین اپنے ائمہ کرام کی آراء سے اختلاف کر سکتے ہیں۔
- نئے پیش آمدہ مسائل کے حل میں فقہی بصیرت سے کام لینا چاہیے اور اجتہاد کو کبھی بھی بند نہیں کرنا چاہیے۔